نمبر ۴ جلد (۷) - جولائی ۱۹۰۴ء

ایڈیٹر

شیخ عبد القادر بی - اے

مخزن

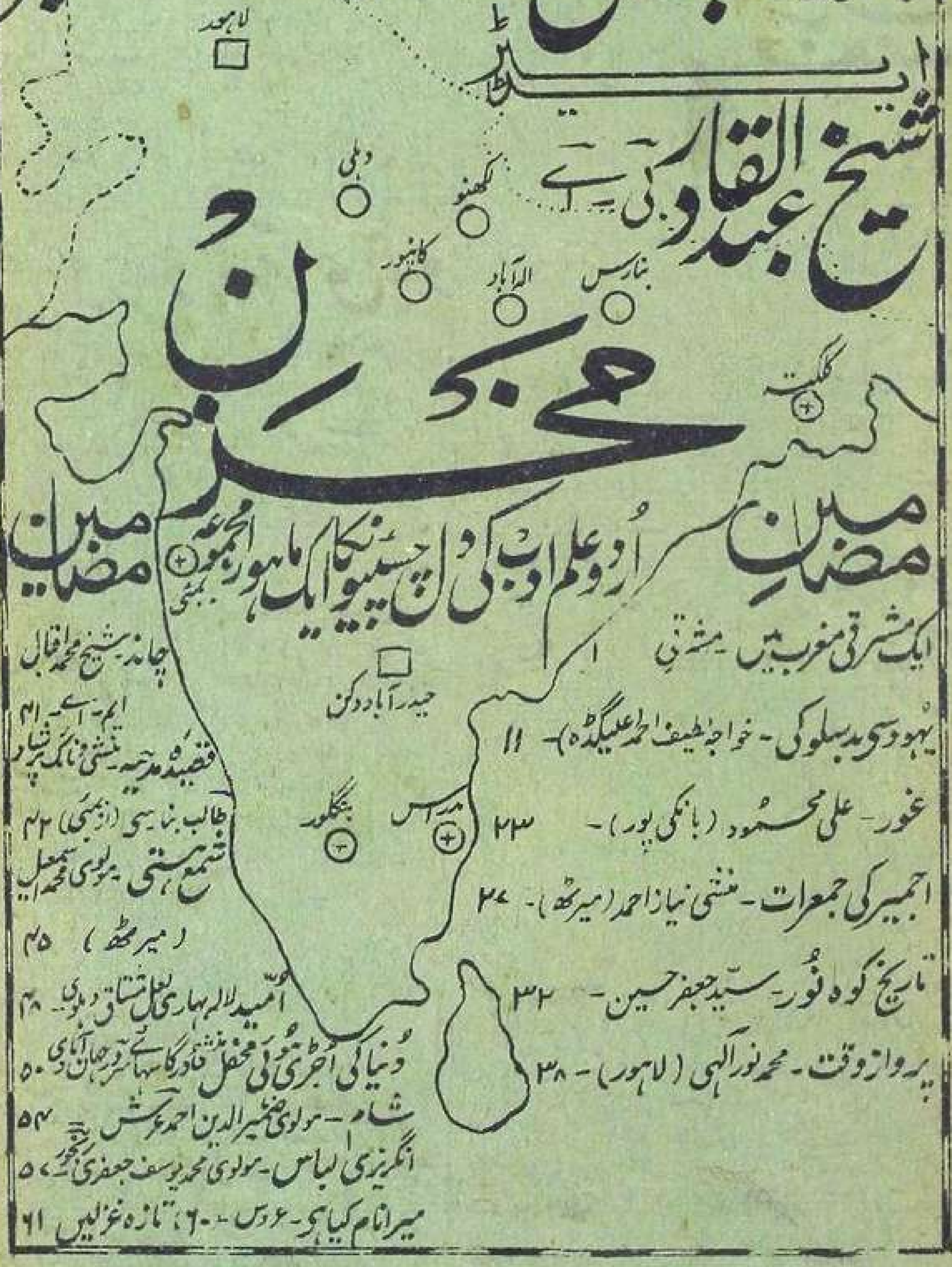

اُردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

مضامین

ایک مشرقی مغرب میں - مشتری ۱
یہ ہوا ہے بدسلوکی - خواجہ لطیف احمد (علیگڈھ) - ۱۱
غور - علی محمود (بانکی پور) - ۲۳
اجمیر کی جمعرات - منشی نیاز احمد (میرٹھ) - ۲۷
تاریخ کوہ نور - سید جعفر حسین - ۳۲
پرواز وقت - محمد نور الٰہی (لاہور) - ۳۸
چاند - شیخ محمد اقبال ایم - اے - ۴۱
قصیدۂ مدحیہ - منشی نانک چند ناز پشاور
طالب بنارسی (بمبئی) ۴۲
شمع ہستی - مولوی محمد اسمٰعیل (میرٹھ) ۴۵
اُمید - لالہ بہاری لعل مشتاق دہلوی ۴۸
دنیا کی اجڑی ہوئی محفل - منشی قادر کا سہائے نرجان آبادی ۵۰
شام - مولوی ضمیر الدین احمد عرشی ۵۴
انگریزی لباس - مولوی محمد یوسف جعفری رنجور ۵۰
میرا نام کیا ہے - ۶۰ درس - ۶۰ ، تازہ غزلیں ۶۱

نو کروڑ ہندوستانی اُردو بولتے ہیں - اور اسی قدر اور ہندوستانی اُردو سمجھتے ہیں -

○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے □ ان شہروں میں اردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے

کارخانہ پیسہ اخبار کی خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور میں منشی محمد عبد العزیز مینیجر کے اہتمام سے چھپا

اور شیخ عبد القادر بی - اے مالک و ایڈیٹر نے شایع کیا

خالص چاندی کے خوشنما زیورات
پانچ سو روپیہ انعام
خضاب زینت شباب
بازو بند دوہرے
آرسی جڑاؤ
جڑاؤ
جگنی
یہ خالص چاندی کی جڑاؤ آرسی ہے جس کے اوپر سونا چڑھایا گیا ہے
بازو بند نگے میناکار خالص چاندی کے
بالکل سونے کے معلوم
خالص چاندی کی
خالص چاندی کی
خالص چاندی کی
خالص چاندی کی
خالص چاندی کی عطردان والی
قسم اول (۸) قسم ادنے (۷)
خالص چاندی کی نگینہ والی انگوٹھی
قسم اول (۸) قسم ادنے (۷)
نواب اشرف اینڈ کمپنی لاہور

مخزن

ایک مشرقی مغرب میں

(از شیخ عبد القادر)

پیارے مخزن! ہر چند مَیں تجھ سے دُور ہوں۔ مگر تجھ سے جُدا نہیں۔ وہ حسرت آلود نگاہیں جو وقتِ رخصت میری طرف اُٹھی تھیں۔ اور وُہ لبِ خاموش جس سے تُونے یہ کہا تھا۔ کہ اب ہمیں کس کو سونپے جاتے ہو۔ مجھے خُوب یاد ہیں۔ مَیں نے چلتے چلتے تیری تسلّی کے لئے دو تین وعدے کئے تھے۔ ایک تو یہ کہ خدمتِ ترتیب مضامین سے بُعدِ مکانی مجھے سبکدوش نہ کریگا۔ دوسرے یہ کہ باقاعدہ مضمون نگاری کا فرض میرے معمولی فرائض پر ایک اضافہ ہوجائیگا اور تیسرے یہ کہ میں تجھے ماہوار اپنے سفر کے حالات لکھتا رہونگا۔ ان تینوں وعدوں کا مَیں پابند ہوں اور بشرطِ خیریت رہونگا۔ تیری محبت میرے دل میں ہے۔ اور رہیگی۔ ویسے تو تیرے چاہنے والونکا حلقہ بہت وسیع ہے اور ہوتا جاتا ہے۔ اور میری خدمتگذاری کچھ تیری زیست کیلئے لازم نہیں۔ بہت سے دوست ہیں جو تیری حالت کو سنبھال سکتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو مجھ سے بہتر اس فرض کو انجام دے سکتے ہیں۔ مگر یہ تیرا احسان ہے کہ تو حقِ دیرینہ کے لحاظ سے مجھے بھی مصروفِ خدمت رکھنا چاہتا ہے۔ مگر تکلف برطرف مَیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو تین وعدے تُونے مجھ سے لئے

اُنمیں سے پہلے دو کی تو تعمیل آسان ہے۔ مگر حالاتِ سفر کی جو پخ لگا دی ہے۔ اسکا نباہنا ذرا مشکل ہے۔

سفرِ یورپ بالعموم اور سفرِ انگلستان بالخصوص اِن دنوں ایک ایسی معمولی بات ہوگئی ہے۔ اور ہمارے اہنائے وطن میں سے اتنے لوگ اب آئے دِن اس منزل کو طے کرتے ہیں۔ کہ اس کے حالات کا بیان ایک پیشِ پا اُفتادہ مضمون بنگیا ہے۔ اب کوئی ایسی نئی باتیں کہاں سے ڈھونڈھ کے لائے۔ جنہیں پڑھ کر اہلِ ہندوستان محظوظ اور مستفید ہوں اور یہ نہ کہیں کہ وُہی داستان کہن جو سو بار پڑھ چکے ہیں۔ دُہرائی جارہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک معمولی روزنامچے یا سفرنامے میں نیا رنگ بھرنا تو قریبِ محال ہے۔ لیکن اگر کوئی اِن چیزوں کی معمولی روش سے جُدا ہو کر چلے۔ اور بجائے یہ قلمبند کرنے کے کہ آج فلاں مقام پر پہنچے اور کل فلاں مقام پر ہونگے۔ یا آج بیمار ہوگئے اور کل تندرست تھے۔ یا آج گرمی نے ستایا اور کل جاڑا بہت پڑا تھا۔ اپنی ذاتی قوتِ مشاہدہ سے کام لے۔ تو اب بھی اِس معمولی سفر میں بہت کچھ رکھا ہے

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

اور سب کچھ جانے دو۔ آدمی مغرب کو مشرقی آنکھ سے دیکھے۔ تو چپّے چپّے پر نگاہ رُکتی ہے۔ اور تفاوت نظر آتا ہے۔ یہی ایک میدان اتنا وسیع ہے۔ کہ عمر بھر اسمیں اشہبِ خیال دوڑایا کرے۔ اور نتیجے نکالتا رہے۔ کون سی چیز مغرب کی اچھی اور قابلِ تقلید ہے اور کون سی بات مشرق کی بہتر ہے اور قابلِ نگہداشت۔ ہمارے اکثر بھائی جو ایشیائی ممالک سے اِدھر آتے ہیں۔ وہ اس اصُول پر کاربند ہوتے ہیں۔ کہ یہاں کے نظارے یہیں کی عینک لگا کر دیکھنے چاہئیں۔ اِس لئے سب سے پہلے وہ اپنے آپ کو یہاں کے رنگ میں پُوری طرح رنگ لیتے ہیں۔ اور پھر سیر

شروع کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ مغرب کو پوری طرح سمجھنے کے لئے اور اس کے خیالات اور عادات کی تہ کو پہنچنے کے لئے یہ طریق زیادہ مفید ہو۔ مگر اپنی اپنی پسند ہے۔ مَیں تو پہلے طریق کا زیادہ قائل ہُوں اور ایک دم بھر کے لئے اِس خیال کو جُدا نہیں کر سکتا۔ کہ میں مشرقی ہُوں۔ میرا گوشت۔ پوست۔ اُستخوان سب مشرقی آب و ہوا میں نشوو نما پائے ہوئے ہیں۔ چال ڈھال میں مشرق کا رنگ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دماغ مشرقی تربیت کے سانچے میں ڈھل چکا ہے۔ اب میں کوئی دُوسری عینک چڑھا بھی لُوں۔ تو درست کہاں بیٹھتی ہے۔

مشرق اور مغرب کا تفاوت وطن سے نکلتے ہی نظر آنے لگتا ہے۔ ہندوستانیوں کے لئے بالعموم بمبئی بابِ لنڈن ہے۔ وہاں سے جہاز پر سوار ہوتے ہی جونہی کسی نے مغرب کی طرف رُخ کیا۔ وُہ اسکی حداثر میں آگیا۔ جہاز کیا ہے۔ ایک شہر رواں ہے مغربی دُنیا کا ایک چھوٹا سا قصبہ جس میں ہزار بانسو زن و مرد بستے ہوں۔ فرض کر لیجئے کہ کسی نے اسکو پہئے لگا دیئے ہیں اور وُہ چل رہا ہے۔ خدا جانے ہمارے مُلک میں ہزار میں کتنے آدمی ایسے نکلینگے جنکے ذہن میں کوئی صحیح اندازہ جہاز کی کیفیت کا موجود ہے جو لوگ بحری سفر کر آئے ہیں۔ اور جن کی تعداد بمقابلہ کروڑوں کی آبادی کے بالکل قلیل ہے۔ انکو چھوڑ کر۔ میرا خیال ہے کہ بمشکل ہزار میں دو تین آدمی ایسے ہونگے جنہیں معلوم ہے کہ آج کل کا ایک دخانی جہاز کس قدر وزن دار۔ کتنی گنجایش والا کتنی آسایش والا اور سوائے خاص حوادث کے جو خشکی اور تری دونو جگہ یکساں ممکن ہیں۔ کتنا محفوظ ہوتا ہے۔ اگر یہ بات عام طور پر معلوم ہو۔ تو یقیناً وہ خوف و خطر جو لاکھوں دلوں میں سفرِ بحری کے متعلق جاگزین ہے۔ بالکل دُور ہو جائے۔ اور کوئی شخص اپنے عزیز کو سفرِ بحری کے لئے رخصت کرتے ہوئے۔ اُس سے زیادہ متفکر نہ ہو۔ جتنا ریل کے ایک لمبے سفر کے لئے سوار کراتے وقت ہوتا ہے۔ کیونکہ درحقیقت

جہاز کا سفر صرف احتمالِ علالتِ بحری کو چھوڑ کر (جو کبھی دو چار دن سے زیادہ نہیں ستاتی۔ اور ایک عمدہ مسہل کا اثر رکھتی ہے) ریل کے سفر سے بدرجہا آرام کی چیز ہے۔ اور اگر حسنِ اتفاق سے سمندر میں تموج یا تلاطم نہ ہو۔ تو جہاز کا سفر۔ خصوصاً اوّل و دوم درجے میں سفر کی مشابہت سے بالکل خارج ہو جاتا ہے۔ جہاز پر پہنچتے ہی افسرانِ جہاز مسافروں کی رہبری کے لئے حاضر ہوتے ہیں اور انکو اپنے اپنے کمروں کی راہ بتاتے ہیں۔ ایک ایک کمرے میں دو یا زیادہ سے زیادہ تین مسافروں کے لئے جگہ ہوتی ہے۔ سفید گدیلے بچھے ہوتے ہیں۔ اُن پر تکیے دھرے ہوتے ہیں۔ ہر شخص کی نشست کے نیچے اُس کا اسباب حفاظت اور ترتیب سے رکھا ہوتا ہے۔ کیونکہ سوار ہونے سے پہلے اسباب جہاز والوں یا اُنکے ایجنٹوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ سوار ہونے کو آدمی آرام سے۔ یک بینی و دو گوش یا بہت ہوا تو ایک چھوٹا سا بیگ ہاتھ میں لئے جاتا ہے۔ اُسی کمرے میں ہاتھ مُنہ دھونے کے لئے پانی۔ سلفچی۔ تولیا۔ صابون موجود رہتا ہے اور آرائش کے لئے آئینہ بھی حاضر ہوتا ہے۔ اس میں متمکن ہو گئے تو اختتامِ سفر تک نہ کہیں اسباب اٹھوانا۔ نہ گاڑی بدلنا۔ نہ شور۔ نہ غُل۔ نہ چیخ پکار۔ اور یہ سب باتیں ریل میں جان کھاتی ہیں۔ متمکن ہونے کے بعد برآمدے میں نکل آؤ یا چھت پر چلے جاؤ۔ تو ہر شخص کی اپنی اپنی آرام کُرسی موجود ہے۔ عام نشست کے لئے آراستہ کمرے موجود ہیں کہیں چند آدمی بیٹھے گنجفہ کھیل رہے ہیں۔ کہیں شطرنج۔ چھت پر ایک طرف لوگ ورزش کے لئے ٹہل رہے ہیں۔ دوسری طرف طرح طرح کے کھیل ہیں۔ یہانتک کہ گیند بلا بھی۔ کھانے کی گھنٹی ہوئی اور سب لوگ ایک وسیع ہال میں جمع ہوئے۔ جس میں بیسیوں میزیں لگی ہیں۔ انپر دسترخوان قرینے سے چُنے ہیں۔ پانی ہے۔ برف ہے۔ چارے۔ میوے ہیں۔ قفلیاں ہیں۔ اور نفیس انگریزی کھانے ہیں۔

چار وغیرہ کے اوقات ملا کر دن رات میں پانچ دفعہ کھانا پیش کیا جاتا ہے۔ لوگ بیٹھے ہوئے کھا رہے ہیں۔ دوستوں سے باتیں کر رہے ہیں۔ بولتے ہیں۔ اور سفر طے ہو رہا ہے۔ بعض اوقات تو اچھے جہاز میں ذرا سی جنبش بھی نہیں معلوم ہوتی۔ آدمی اچھی طرح لکھ سکتا ہے۔ بغیر اس کے کہ قلم کو لغزش ہو۔

اب اس سے زیادہ آرام کا سفر اور کیا ڈھونڈھتے ہو۔ ہمارے ہاں اکثر لوگ اپنے خیال میں جو جہاز کی تصویر کھینچتے ہیں۔ تو وہی پرانے سندباد کے زمانے کے جہاز خیال میں لاتے ہیں۔ جو بادبانوں کے زور سے چلتے تھے اور جنکا ناخدا آئے دن اپنے سر کے بالوں کو نوچتا اور اپنے گالوں کو پیٹتا تھا۔ اور چلا کر کہتا تھا۔ اے بھائیو۔ طوفان کے آثار ہیں اور ابھی جہاز ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگا۔ یا چٹانوں کے قریب آگیا اور اب ٹکر سے بچنا محال ہے۔ اس مقابلہ سے میرا یہ مقصد نہیں۔ کہ میں اُن زمانہ قدیم کے جہاز رانوں کی قدر گھٹاؤں۔ میرے دل میں اُنکی نہایت تعظیم ہے۔ اگر وہ نہ ہوتے تو نہ یہ اس زمانے کے عمدہ اور محفوظ جہاز ہمیں نصیب ہوتے اور نہ کسی کو یہ سمندر کے راستے معلوم ہوتے۔ یہ اُنہیں کے کارنامے ہیں۔ کہ آج ہم اس آسانی سے سفرِ بحر کر سکتے ہیں۔ ہر فن میں موجد اور ابتدائی بنیاد ڈالنے والے قابلِ شکریہ ہوتے ہیں۔ گو اُنکا کام بمقابلہ بعد کے ترقی یافتہ کام کے بے ڈول ہی ہو۔ مگر میرا یہ مطلب ہے۔ کہ اس سفر کی جو مشکلات تھیں اُن کا تو انہی جوانمرد اور باہمت دلیروں کے ساتھ خاتمہ ہو گیا اور اس زمانہ میں تو مسافر کے لئے یہی رہ گیا ہے کہ آنکھیں بند کر کے جہاز پر بیٹھ جائے۔ وہیں بیٹھا ہوا آرام سے سویا کرے۔ کھاتا پیتا رہے ٹہلتا رہے۔ پڑھتا رہے۔ لکھتا رہے اور پندرھویں سولہویں دن ساحلِ یورپ پر جا پہنچے۔ ہم ۱۴۔ مئی ۱۹۰۴ء کو بمبئی سے چلے اور ۲۸۔ مئی کی صبح کو مارسیلز

تھے۔ جہاں سے ریل نے ۲۴ گھنٹے میں لنڈن پہنچا دیا۔ اب اگر اس سفر کو بھی ہندوستان میں بڑا کمال سمجھیں اور اس کے مسافر کو یوں رخصت کریں۔ جیسے کسی بڑے خطرہ میں ڈالتے ہیں۔ تو ہمارے ہموطنوں کی مرضی۔ سوائے اس کے کہ دُنیا اُن کی پست ہمتی پر ہنسے اَور کیا ہو سکتا ہے۔ اور یہی وُہ بات ہے جس میں سب سے پہلے مشرق اور مغرب میں فرق نظر آتا ہے۔ فرنگستان کے لوگ ہوتے ہیں کہ خوش و خوّرم۔ ایک ایک دن کو جو سمندر پر گذرتا ہے۔ اور جس میں انہیں سمندر کی صاف اور رُوح افزا ہَوا نصیب ہوتی ہے۔ غنیمت جانتے ہیں اور ایک نسخہ صحت سمجھتے ہیں۔ جسے فارغ رہنے ہنسنے کھیلنے اور آسان اور دلچسپ کتابیں پڑھنے سے مدد دیجاتی ہے۔ تاکہ جب کام کا وقت آئے تو اسوقت کا آرام نفع بخشے۔ مگر ہمارے ہموطن۔ اگر جہاز پر ہوتے ہیں۔ تو عموماً افسردہ۔ پریشان اور دن گنتے نظر آتے ہیں۔ اس میں شک نہیں۔ کہ اس تفاوت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وُہ لوگ اپنے گھروں کو جارہے ہوتے ہیں اور یہ اپنے گھروں سے نکلے ہیں۔ مگر اس وجہ کے اثر کو چھوڑ کر بھی بہت فرق باقی رہتا ہے۔ جو مشرقی اور مغربی طبائع کے اختلاف کا نتیجہ ہے۔ ہمارے ساتھ کئی بیوپاری تھے۔ جنہیں دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔ کہ اب ان لوگوں میں بھی اُبھرنے کی اُمنگ پیدا ہو چلی۔ وُہ اپنے بیوپار کو بڑھانے کی غرض سے عازمِ سفر ہوئے تھے۔ جب چلد پانچ دِن جہاز پر بیٹھے اُنہیں ہو چکے۔ تو اُن میں سے ایک کو میں نے دیکھا کہ اُسے وحشت ہونے لگی۔ بارہا چشم پر آب ہو کر مجھ سے کہتا تھا۔ گھر میں خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ کاروبار بھی اچھا چل رہا تھا۔ میں نے تو مُفت میں یہ دردِ سر مول لیا۔ اپنا عافیت میں بیٹھا ہُوا تھا۔ اب کب تین چار مہینے ختم ہوں اور کب گھر جاؤں۔ کسی اُستاد کے شعر میں ذرا سی مداخلت بیجا کیجائے تو ہمارے دوست کے عین

حسب حال تھا:۔

اس کشمکش سے بحر کی کیا کام تھا ہمیں
اَے جلبِ منفعت ترا خانہ خراب ہو

گھر چھوڑنا بیشک گراں گذرتا ہے۔ مگر جو قومیں دُنیا میں بنی ہیں اور پھلی پھُولی ہیں۔ اُنکی تاریخیں پڑھو اور غور کرو تو معلوم ہوتا ہے کہ کبھی گھر گھُسنے پن سے ترقی نہیں ہوسکتی۔ ہندوستان میں ایک کثیر حصّہ آبادی کا آریہ نسل سے ہے۔ اگر انکے آباو اجداد وسط ایشیا سے نقلِ مکانی نہ کرتے۔ اور اپنے جوہر دُوسرے ممالک میں اپنے سے کم شایستہ اقوام پر ظاہر نہ کرتے۔ تو جو نام اس نسل نے دُنیا کے مختلف حصّوں میں پیدا کیا ہے۔ اُس کا وجود بھی نہ ہوتا۔ جب ہندوستان کے آریوں نے اپنے آپ کو اسی ملک کی چار دیواری میں محدود کر لیا اور اس کے باہر خصوصًا براہ سمندر جانا معیُوب ٹھہرایا۔ تو گویا اُنہوں نے مستقل زوال کا پیش خیمہ نصب کر دیا اور آخر کار ہر حملہ آور کے جور وجفا کا تختۂ مشق رہ گئے۔ اُنہی کے یورپین بھائیوں نے ہمت اور سیر وسیاحت کو اپنا شعار بنایا اور وُہ کیا بذریعہ تجارت اور کیا بذریعۂ فتوحات اطرافِ دنیا میں پھیل گئے۔ وُہ بھی ماؤں کے بیٹے ہی ہیں کیا جو ہر سال انگلستان سے مصر۔ مغربی افریقہ۔ جنوبی افریقہ۔ ہندوستان۔ آسٹریلیا جزائر غرب الہند وغیرہ ممالک کی طرف لاکھوں نکلتے ہیں اور جن میں سے ہزاروں واپس نہیں آتے۔ مگر وُہ سب خواہ کسی کام میں مریں ایک معنی میں شہدا قوم ہیں۔ کہ اپنی قوم کی عزت اور شہرت قائم رکھنے اور اپنے آپ کو اس کے لائق افراد بنانے کا سودا سر میں لیکر جاتے ہیں اور یا اپنی کوشش میں کامیاب ہوتے ہیں یا اسی میں جان ہار دیتے ہیں۔ یہ ہوتے ہیں نشان بڑھنے والی قوموں کے اور یہ ہیں خیالات جن میں اہلِ مشرق کی روشِ اہلِ مغرب سے جُدا ہے۔

جہاز کو عموماً راستے میں بہت تھوڑے تھوڑے وقت کے لئے صرف تین مقامات پر ٹھہرنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ عدن۔ سویز اور پورٹ سعید تینوں مقامات مشہور اور قابلِ دید ہیں۔ بُرا ہو اس طاعون کا کہ دریائے شور پر بھی یہ نہیں تو اس کا نام ہماری جان کا عذاب بنا رہتا ہے۔ دو جگہ تو میڈیکل معائنہ ہوا۔ اور اسی شُبہ سے کہ کسی مسافر کے اندر وبا کے جرم نہ گھُسے ہوں۔ اہلِ جہاز کو خشکی پر جانے اور بندرگاہ کی سیر کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اب سوائے اس کے کہ دُور سے ان مقامات کو دیکھتے۔ یا دُوربینیں تختۂ جہاز پر بیٹھے لگایا کرتے۔ کوئی چارہ نہ تھا۔ اس شوق میں بھی قدرتی طور پر مغربی لوگ مشرقی مسافروں سے بے انتہا بڑھے ہوئے تھے۔ وُہ تو دُوربینیں گلے میں لٹکائے پھرتے تھے اور ایک لمحہ بھر کے لئے انکی جُدائی گوارا نہ کرتے تھے۔ اور ہم تھے کہ ایک آدھ نظر دیکھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ نہرِ سویز عجائباتِ دُنیا میں سے ہے اور اس میں داخل ہوتے ہی عجب فضا کا سین ہے۔

پورٹ سعید تو رات کے وقت پہنچے۔ وہاں اگر اُترنا ملتا بھی تو اسوقت کون جاتا۔ بجلی کی روشنی نے بندرگاہ میں تو رات کو دن بنا رکھا تھا۔ ہم بندرگاہ سے نکلکر گویا یورپ میں پہنچ جاتے ہیں۔ اور ہوا میں غیر معمولی خنکی محسوس ہونے لگتی ہے۔ ع

ٹھنڈی ٹھنڈی تیرے کوچے سے ہوا آتی ہے

جبھی تو یہ گوری رنگت۔ یہ سُنہرے بال۔ اور یہ بلوریں آنکھیں۔ پیدا ہوتی ہیں۔ جنہوں نے آج کل ایک زمانے کو مفتون بنا رکھا ہے اور جن پر خود ان بالوں والے اور ان آنکھوں والے اتنے نازاں ہیں۔ کہ انہیں اَوروں کو اپنے جیسے اِنسان سمجھنے میں کلام ہے۔ ہاں جو لوگ اُن میں غور و فکر کی قابلیت رکھتے ہیں۔

وُہ جانتے ہیں کہ اصل وجہ فضیلت اُن کا علم و کمال ہے - نہ کہ رنگ و روغن - رنگ روغن نے سونے پر سہاگے کا کام دیا ہے - مگر سونا وہی اُنکے عقلی جوہر ہیں - جنکی بدولت دُخان اور بجلی اور ہوا اور شعاعیں انسان کی خدمت میں لگادی گئی ہیں - اور بہت سی قدرتی طاقتوں کو ایک حد تک مطیعِ فرمانِ انسانی بنالیا ہے - یہ وُہ جوہر ہیں جنکی تلاش میں مشرقی لوگوں کو یہاں آنا چاہیئے - ورنہ رُخ و چشم و بناگوش و خال کی اُنکے ہاں کیا کمی ہے - اِنسان فطرتاً جدّت پسند ہے - مغرب کے لوگ مشرق میں کسی کی ملاحت کے شیدائی بنجاتے ہیں - اور مشرقی مغرب میں کسی کی صباحت کو دیکھ کر پھڑک جاتے ہیں - پھڑک جانا تو ایک طرف - وُہی انداز اپنے میں پیدا کرنا چاہتے ہیں - لیکن اُس کا نتیجہ تو وُہی "کوّا چلا ہنس کی چال" ہی رہتا ہے -

مارسیلز بھی اب بحری تجارت کا ایک بڑا مرکز بنگیا ہے - اور اس کے بندرگاہ میں اتنے جہاز پڑے رہتے ہیں - جنکا شمار کرنا آسان نہیں - ہر ایک پر اُس کی قوم کا جھنڈا لہراتا ہے - کوئی سوار یاں لے چکا ہے - اور چلنے کو ہے - کوئی ابھی آکے ٹھہرا ہے - کوئی دو تین دن سے آیا ہوا ہے اور سستا رہا ہے - کوئی زیرِ مرمّت ہے اور درست کیا جارہا ہے - کسی کے انتظار میں لوگ پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں - جب ہمارا جہاز لنگر ڈالنے کو تھا - تو اُس کے سامنے کا پلیٹ فارم عورتوں مردوں اور بچّوں سے پُر تھا - عورتیں اکثر سودا بیچنے والی تھیں - بہت سی تو پھولوں کے گلدستے لائی تھیں - کہ مسافر اُترتے ہی خرید لینگے - یا اُن کے دوست جو استقبال کو آئے ہونگے وُہ اُنکو تحفے دینگے - کچھ کھلونے لائی تھیں - کچھ اور چیزیں میوے وغیرہ - اُنکی مصروفیت کا یہ عالم تھا - کہ وقتِ انتظار سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ہاتھ میں جُرابیں وغیرہ بُننے کا کام لئے

ہُوئے تھیں۔ مردوں میں کچھ تو مسافروں کے دوست احباب تھے اور کچھ مختلف کمپنیوں کے قائم مقام۔ ٹامس کُک کے ایجنٹ۔ کنگ کمپنی کے ایجنٹ۔ گرِنڈلے گرُوم کے ایجنٹ۔ اپنے اپنے مسافروں کا اسباب سنبھالنے۔ اُنکے ریل کے ٹکٹ درست کرانے اور انکو ہر طرح کی اطلاع اور آسائش بہم پہنچانے کے لئے آمادہ تھے۔ یہاں یہ انتظام نہایت اعلےٰ اور مفید ہے۔ بچے بالعموم مفلس لوگوں کے جمع تھے۔ جو بھیک مانگنے کو وہاں آئے تھے۔ اور گا گا کر منّتیں کرتے تھے۔ اور ٹوپی ہاتھ میں لیکر دستِ سوال پھیلاتے تھے۔ عام تموّل کے درمیان اس درجہ کے افلاس کا نظارہ جو ہندوستان کے عام افلاس کی یاد تازہ کرتا تھا۔ دلخراش تھا۔ ہم نے گاڑی لیکر ایک سرسری نظر سے مارسیلز کے بازاروں اور اس کے گرد و نواح کو دیکھا۔ پیرس سے تو اُسے کوئی نسبت نہیں۔ مگر بجائے خود نہایت سُتھرا اور سیر حاصل شہر ہے۔ شام کو ریل میں سوار ہُوئے۔ چاندنی رات تھی اور باہر کی دُنیا کچھ نظر آتی تھی۔ ایسا معلوم ہوا کہ دو رویہ باغات ہیں جن میں سے ریل گذر رہی ہے۔ صبح کو جو اچھی طرح دیکھا تو معلوم ہوا کہ مُلک فرانس مارسیلز سے لیکر پیرس تک گویا ایک مسلسل بے نظیر باغ ہے۔ بلا مبالغہ ایک چپہ بھر زمین نہیں نظر آئی۔ جو سرسبز نہ ہو۔ یا بوئی جوتی نہ جا چکی ہو (یہاں کی کاشتکاری کی تفصیل اخبار زمیندار کا حصّہ ہے۔ اگر موقعہ ملا تو وہاں مفصّل لکھونگا) پیرس ہوتے ہوئے ہم کیلے پہنچے اور وہاں سے پھر ایک چھوٹے سے جہاز پر سوار ہو کر گھنٹہ بھر میں ساحلِ انگلستان پر تھے۔ ڈوور سے ریل ملی۔ جس نے تین گھنٹے میں لنڈن پہنچا دیا۔ ۲۹۔ مئی کی رات لنڈن میں آئی۔ اب یہاں کچھ عرصہ کے لئے قیام ہوگا۔ اور تجھے بجائے سیر و سیاحت کی داستانوں کے مقامی تجربات اور مشاہدات کا حال سُنایا کرونگا۔ لو۔ اب خدا حافظ۔ ع پھر ملینگے اگر خُدا لایا +

مشرقی

یہود سے بدسلوکی

یہود کا طبعی میلان کچھ خصوصیت سے تجارت کی طرف نہیں تھا - ابتدائی زمانہ میں گلہ بانی - کاشتکاری یا اور پیشوں میں مصروف رہے - جب سلطنتِ مقدونیہ کا ستارہ اوج پر تھا - اور مختلف قوموں کے باہمی تعلقات بڑھ کر تجارت کا شوق ہر دل میں پیدا ہو گیا - اُسوقت البتہ یہودیوں نے بھی پر پرزے نکالے تاہم انکی تجارت محدود تھی - لیکن جب وُہ مختلف ملکوں میں نکالے گئے تو مجبوراً انہیں وُہ پیشے اختیار کرنے پڑے جو انکے آبائی پیشوں سے بالکل مختلف تھے - جن قوموں سے اُنہیں پالا پڑا اُنسے حسد کرتی تھیں اور انکو زمین کا مالک دیکھنا یا کسی اور معزز پیشے میں مصروف پانا انکی دلی جلن کا باعث ہوتا تھا اور وہ ہر ایک قسم کی رکاوٹ پیدا کرنے میں دریغ نہ کرتی تھیں - پس تجارت انہیں نہایت آسان اور قدرت کے مطابق ذریعۂ معاش سُجھائی دیا - اور جب انہوں نے اِسے اختیار کر لیا تو اس میں انہیں ایک خاص مہارت اور ہوشیاری حاصل ہوتی گئی - انکی کامیابی نے ان میں ایک نئی طبیعت اور ایک نیا مادہ پیدا کر دیا - جو انکے اسلاف میں معدوم تھا - اس تجارت کے جوش نے انہیں مُلک مُلک میں پھیلا دیا - حتّٰی کہ جہاں دیکھو سوداگر یہود ہی نظر آتے تھے - سلطنتِ رُوم کے عہدِ زوال میں یورپ اور ایشیا کے درمیان جو کچھ تعلق تھا وُہ یہود ہی کی بدولت تھا -

اِس عجیب انقلاب کے بعد اُنہیں ایک نئے مذہب سے واسطہ پڑا - جو یونانی - رومن اور ٹیوٹن مذہبی خیالات سے بالکل پاک تھا - یہود کو یہ توقع تھی کہ نیا مذہب اسلام ان سے بمقابلہ اور قوموں کے بہتر سلوک کریگا - چنانچہ حقیقت میں ایسا ہی ہوا - ایسے موقع

شاذ ہیں کہ مسلمانوں نے انپر ایسی سختی کی ہو جو اُس سختی سے زیادہ ہو جو انہیں نصاریٰ کے ہاتھوں سے پہنچی ورنہ عموماً مسلمان اُن سے نہایت شفقت سے برتاؤ کرتے تھے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہود عرب میں - بابل میں - ٹرکی میں پھیل گئے - بڑے بڑے شہروں میں انکے محلّے کے محلّے آباد تھے - جا بجا انکے مدارس تھے جہاں انکے مذہبی پیشوا لوگوں کے ہجوم کو اپنے جوشیلے مذہب کی تعلیم دیتے تھے - مسلمانوں کے ساتھ ساتھ وہ شمالی افریقہ میں پہنچے اور انہیں اپنی مقدرت کے موافق اسپین کی فتح میں کافی مدد دی -

مورز کی تہذیب کی روشنی پھیلنی شروع ہوئی - جس نے مغرب میں فلسفہ کی چنگاری کو منوّر کر دیا - ہنر و اور پیشہ ور گروہوں سے شہر آباد ہو گئے - شاعری جس نے اخلاق و اطوار کی اصلاح کی - گھر گھر پھیل گئی - بہت سے سائنس کے مسائل دریافت ہوئے - یہ وہ زمانہ تھا جب عیسائی ملکوں میں جہالت کی تاریک رات چھائی ہوئی تھی - یہود کے لئے یہ زمانہ ترقی کے واسطے خاص تھا - خلفا کے زمانہ میں انہیں مسلمانوں کے برابر آزادی حاصل تھی - انکی کوششیں مفید نتیجوں کے پیدا کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں -

شرقیین کے عہد حکومت میں بنی اسرائیل نہایت خورم و شاداں تھے - انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوئی - شارلیمین کے زمانہ میں بھی اُن سے نرمی کیجاتی تھی اور انکی عزت کیجاتی تھی - چنانچہ اُس نے جو پیغام ہارون رشید کے دربار میں بھیجا وہ اسحٰق یہودی ہی کے ہاتھ تھا - سولے خاص موقعوں کے یہود اسکی دوستی کا دم بھرتے تھے اور اس کے حمد تھے - شارلیمین کے جانشینوں کے عہد میں اُنہیں اور بھی عروج ہوا - لیکن عہد وسطیٰ میں ہم اُنپر قتل اور ظلم کے نہایت خوفناک واقعات سے تاریخ کے صفحے سیاہ پاتے ہیں -

عیسائیوں کا کوئی فرقہ یا کوئی قوم اپنے آپ کو اس الزام سے بری نہیں کر سکتی کہ

اُنہوں نے یہود کے ساتھ بعید از انسانیت سلوک کیے ہیں - انکو ستانا اور تکلیف دینا ثواب سمجھا جاتا تھا - جوشیلے عیسائی کہا کرتے تھے کہ جب ہمیں کافروں سے خصومت رکھنی ہی ہے تو پھر کیوں نہ ہم اُنسے اپنے مُلک میں بھی لڑیں - بہادرانہ طبیعت کے لوگ خواہ مرد ہوں یا عورت اپنی شجاعت کی نسبت سے یہود کے ساتھ زیادہ بُرا سلوک کرتے تھے - رچرڈ اوّل سینٹ لوئیس او فرانس - فرڈینینڈ - اسیبلا - لیوتھر - میریا تھیریسا اِسی گروہ میں سے ہیں -

مگر تہذیب اور شائستگی اس قوم کی جو ایسی بیرحمی سے شکار کی گئی ایک بڑی حد تک ممنون ہے - یہود ایک تجارت پیشہ قوم ہو گئے تھے - علوم اور سائنس کی ترقی میں انکا بھی بڑا حصہ رہا ہے - اُنہوں نے یونانی تصانیف کو عربی میں ترجمہ کیا - جہاں سے وہ السنہ یورپ میں فوراً نمودار ہوئیں - اور مغرب کے نئے دارالعلوم تک پہنچیں - طب میں بھی اُن کا حصّہ کچھ کم نہیں ہے - عموماً وہ کتابوں کے شائع کرنے والے اور مترجم تھے - ادب میں بھی لکھتے تھے - اُنکے مدارس مونٹ پلر فرانس - سلرنو اٹلی میں - سویل اسپین میں - علما اور سائنس کے تجربہ کرنیوالوں سے بھرے ہوئے تھے - جس زمانہ میں دنیا بھر میں تنگ اور ضعیف الاعتقادی کا دور تھا وہ قریب قریب اِس سے نیچے ہوئے تھے -

یہودیوں پر ظلم و تعدی کی حکایات نصاریٰ کی تواریخ میں بھی پائی جاتی ہیں - سائیسوبٹ شاہ سپین کے عہد میں سب سے پہلے اُنپر ظلم ہونا شروع ہوا - چنانچہ وُہ خوشی خوشی اسلامی حکومت کو عیسائی حکومت پر ترجیح دیکر وہاں سے نکلے اور اسلامی ممالک میں جا کر بسے جہاں کہ وُہ مسلمانوں کے برابر برابر برادرانہ تعلقات کے ساتھ پھولتے پھلتے رہے - صلیبی لڑائیوں میں اُنہوں نے کوئی حصّہ نہیں لیا اگرچہ وُہ اُس دیوانہ وار مذہبی جوش سے کچھ عرصہ تک بچے رہے - مگر انکا زمانہ امن

بہت تھوڑا تھا۔ سنہ ۱۲۱۲ء میں جب مورز کے مقابلہ میں عیسائیوں کو ایک بڑی بھاری شکست ہوئی (اور جس شکست کا باعث یہ بتایا جاتا تھا کہ بادشاہ ایک یہودن کی محبت میں مدہوش تھا) بارہ ہزار یہودی سخت بیرحمی سے تہ تیغ کئے گئے۔ موت سے بچنے کے لئے بہت سے یہودی برائے نام عیسائی ہو گئے۔ اگرچہ وُہ اِسی ظاہری مذہبی تبدیلی کی بدولت اعلیٰ مرتبوں پر پہنچے مگر حقیقتہً وہ دِل میں یہودی ہی تھے۔ ایک زمانہ میں اُن لوگوں کی حالت جو اپنے مذہب کی پابندی کھُلم کھُلا کرتے تھے۔ بہتر تھی اُن سے جو بظاہر عیسائی تھے اور دِل میں یہودی۔ سنہ ۱۴۹۲ء میں ایک حکم نافذ کیا گیا کہ یہودی اگرچہ اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے اور بلند مرتبہ بھی ہیں فوراً اس سرزمین سے نکل جائیں۔ ملکہ اِسبیلا نے جو اپنی ذات سے تو بری طبیعت کی عورت نہ تھی۔ لیکن چونکہ پادریوں کا اثر اسپر بہت زیادہ تھا اس تجویز کو منظور کر لیا۔ فرڈیننڈ محض اپنی پولیسی کی وجہ سے (کیونکہ اُس میں انسانی ہمدردی تو کچھ ایسی نہ تھی) ایک عرصہ تک سوچتا رہا۔ اور آخر کار جب فیصلہ کیا تو بیان کیا جاتا ہے کہ محل میں ایک عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔ ایبرنل ایک یہودی جو ایک بلند مرتبہ اور قابل آدمی تھا اور بلحاظ اس اثر کے جو اسکو اپنی قوم پر حاصل تھا اور اس عزت کے جو اُس کے دشمن کرتے تھے دانیال پیغمبر سے مشابہ کیا جاتا تھا۔ بادشاہ اور ملکہ کے سامنے گیا اور اُنکے پاؤں میں گر گیا۔ گڑگڑا کر اُس نے التجا کی کہ میری قوم کی جلاوطنی کا حکم منسوخ کیا جائے۔ تین لاکھ ڈکٹ (جو تقریباً دس لاکھ یا اکیس لاکھ روپیہ کے برابر ہو سکتے ہیں) اُس نے اس کی عوض میں پیش کرنے چاہے۔ اتنے میں طرقومیدہ نامی ایک پادری صلیب ہاتھ میں لئے ہوئے برآمد ہوا۔ اور بادشاہ اور ملکہ کے سامنے بے خطر ایک مختصر تقریر کی۔ اور اُن دونوں ہاجیاؤں کو ایک رحم کے فعل سے مانع ہوا جو غالباً اُس کی غیر موجودگی میں اُن سے سرزد ہوتا۔

کونسی حکایت اِس سے زیادہ اندوہناک ہوسکتی ہے اور کونسا نظارہ اس سے زیادہ دردناک ہوسکتا ہے۔ جسوقت یہود اس مُلک سے رخصت ہونے لگے۔ وُہ اسپین کو اپنا وطن سمجھنے لگے تھے۔ اور اس سے اسِی قدر محبّت کرتے تھے جتنی انہیں کنعان سے تھی۔ رخصت ہوتے وقت وہ اپنے بزرگوں کی قبروں سے مل مل کر روئے۔ اور انہیں ہمیشہ کے لئے الوداع کیا۔ بعض انکی قبروں کے پتھروں کو اپنی اس آوارگی میں ساتھ لئے پھرتے تھے۔ راہوں میں اِن مہاجرین کی قطاریں کی قطاریں چلتی دکھائی دیتی تھیں۔ بعض اوقات وُہ نقارہ بجاتے تھے۔ جسکا حکم اُنکے بزرگوں اور پیشواؤں نے اس مصلحت سے دیا تھا کہ مبادا ان مصیبت زدوں کے دل بالکل بیٹھ جائیں اور وہ ہمّت ہار بیٹھیں۔ انکے سروں پر یا تو انکے مقدّس قانون کے نوشتے تھے۔ یا کچھ سرمایہ جسقدر وُہ اٹھانے کے قابل تھے۔ زرخیز زمینیں کپڑے کی چیتھڑوں کے عوض میں زبردستی اُن سے خریدی جاتی تھیں۔ عُمدہ سے عُمدہ محل ایک خچر کے تبادلہ میں لے لیا جاتا تھا۔ بڑی بڑی رقمیں جو اُنکی واجب الادا تھیں ضبط کرلی گئیں۔ غرض ہر طرح وُہ ظالموں کا شکار بنے۔ روپیہ پیسہ کو جو کچھ وُہ ظالموں کے ہاتھوں سے بچا سکے اُنہوں نے خچروں کے زینوں میں اور گٹھڑیوں میں چُھپا چھپا کر رکھا اور بندرگاہوں کی طرف چلے۔ دُنیا بھر میں صرف تُرک ہی ایک ایسی قوم تھی جس نے مہربانی اور شفقت سے اُنہیں خوش آمدید کہا۔ جو لوگ مراکو یا الجیریا میں گئے۔ انہیں غلام بنا بنا کر بیچا گیا۔ انہیں فاقوں مارا گیا۔ اور ہیرحم لوگ اس خیال سے کہ وُہ جواہرات اور اشرفیاں نگل گئے ہیں۔ اِنکے پیٹوں کو چاک کر دیتے تھے۔ سب عیسائی سلطنتیں اِنکے واسطے مثل دیوار کے ایک سدّ تھیں اٹلی نے البتّہ اُن پر کسی قدر رحم کیا۔ مگر یہ رحم مطلقاً خودغرضی پر مبنی تھا۔ پوپ سے کسی مہربانی کی توقع اسکی نیک دلی پر مبنی نہیں تھی بلکہ اس کی خودغرضی پر

چنانچہ تھوڑے دن بعد ہی اٹلی میں بھی نہایت دردناک واقعات پیش آئے۔

پرتگال میں اوّل اوّل نرم سلوک کی اُمید ہوئی اور بہت سے بے خانماں وہاں چلے گئے۔ لیکن یہاں کے بادشاہ کی شادی اسپین کی شاہزادی سے ہوئی اور یہاں بھی انہیں پہلے سے بھی زیادہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ نہ صرف ملک بدر ہونیکا حکم انہیں دیا گیا۔ بلکہ انکے بچے تک بھی اُن سے چھین لئے گئے کہ انہیں عیسائی بنائیں یہانتک کہ مائیں مایوس ہو ہو کر اپنے لخت جگروں کو دریاؤں اور کنوؤں میں ڈالدیتی تھیں اور آپ خودکشی کر لیتی تھیں۔ قتل و غارت کی جس قدر بھی حکایتیں سُنی جائیں وُہ قریب قریب سب یقین کے قابل ہیں۔ اسپین سے جو لوگ نکالے گئے وُہ نہ صرف ساہوکار۔ سوداگر۔ اطبا اور علما ہی تھے۔ بلکہ اُن میں زراعت پیشہ اہلِ حرفہ اور مزدور بھی تھے۔ یہود کے اسپین سے رُخصت ہوتے ہی تہذیب و شائستگی نے بھی اس ملک کو خیرباد کہا۔ آبادی بہت کم ہو گئی۔ باشندے دلِ شکستہ ہو کر ہمت ہار بیٹھے۔ اور زمین ایسی ویران ہوئی کہ اب تک اُسی حالت میں پڑی ہے۔ اِس کے دو سو برس بعد بھی اسپین کا تعصب کم نہ ہوا۔ ۱۶۸۰ء میں چارلس ثانی کی شادی کے موقعہ پر ایک دردناک واقعہ کا وقوع قابلِ توجہ ہے۔ میڈرڈ میں ایک مربع میدان میں ایک چبوترہ پر شاہی خاندان کی نشست کے لئے ایک بلند اور ممتاز جگہ بنائی گئی۔ درباری زرق برق کی پوشاکیں پہن پہن کر آئے۔ راہبوں کے جوق کے جوق آئے۔ اور عوام کی تو کچھ شمار ہی نہ تھی۔ آٹھ بجے کے قریب وُہ غمناک منظر جسے موت کا جلوس کہنا بجا ہے دیکھنے میں آیا۔ آگے آگے تقریباً سَو سیاہ پوش جنکا کام آگ جلانا اور دہکانا تھا نیزے ہاتھوں میں لئے تھے۔ اُنکے پیچھے راہبین کے گروہ نظر آئے۔ اُنکے پیچھے پیچھے اُمرا اور درباری صلیب اور جھنڈے ہاتھوں میں لئے ہوئے آ رہے تھے۔ اِس تزک و شان کے ساتھ مظلوم

یہودی جن میں مرد و عورت دونو تھے آئے۔ سب کی نظریں انہی پر پڑی تھیں اور سب کو انہی سے دلچسپی تھی۔ کیونکہ یہ بیچارے زندہ جلائے جانیوالے تھے۔ اور صرف اس گناہ میں کہ انہوں نے مذہبِ عیسوی کے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک ایک موٹے اور زرد رنگ کے کپڑے کا فرغل پہنے ہوئے تھا۔ جنپر اودے رنگ کی آگ کے شعلوں۔ بھوتوں۔ سانپوں اور صلیب کی شکلیں منقش تھیں۔ انکے سروں پر لمبی لمبی نوکدار ٹوپیاں تھیں۔ اور گلے میں ایک تختی تھی جس سے ہر ایک کا نام اور گناہ معلوم ہو جاتا تھا۔ عرصہ تک قید خانے کے اندھیرے اور سیل کے اثر سے انکے چہرہ کے رنگ زرد تھے۔ مگر آج یہ لوگ خوش معلوم ہوتے تھے کہ انکی تکلیفیں اور مصیبتیں اس دن ختم ہو جائینگی۔ جب یہ دہلانے والا جلوس شاہی مقام کے سامنے سے گذرا تو ایک سترہ برس کی لڑکی جسکا حسن باوجود ان مصائب کے بھی زائل نہ ہوا تھا۔ ملکہ کی طرف مخاطب ہوئی اور چلا کر کہنے لگی "۔ اے نیکدل ملکہ کیا تو اتنی قدرت نہیں رکھتی کہ میری جان بچالے۔ میری ماں نے مجھے اپنے دودھ میں اپنا مذہب گھول کر پلایا ہے۔ تو کیا میں اس مذہب کے واسطے جان دیدوں"؟ ملکہ کے آنسو بھر آئے اور اُن سے اپنا منہ پھیر لیا۔ اور اگر وہ اس کی سفارش بھی کرتی تو شاید اپنی جان کو بھی خطرہ میں ڈالتی۔ یہ لڑکی نالہ و قطار روتی ہوئی اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اپنی قسمت کا لکھا بھگتنے کے واسطے چلی گئی۔ سورج ڈھلنے کے قریب بھجن گائے گئے اور یہ مصیبت زدہ گروہ ہلاکت کے کنارہ پر پہنچگیا۔ شہر کے ایک طرف ایک پتھر کا چبوترہ تھا جسکے چاروں کونوں میں چار پیغمبروں کے بت جنکی صورتیں بگڑ گئی تھیں کھڑے تھے۔ جو شخص اپنے گناہوں سے اس آخری وقت میں پشیمان ہوتا اُسکو جلانے سے پہلے پھانسی دیجاتی تھی۔ اوّل مُردوں کی ہڈیاں جلائی گئیں اور پھر زندہ گنہگار دہکتے ہوئے انگاروں میں جھونک دیئے گئے۔ خود بادشاہ

اینڈہن کے گٹھوں میں آگ لگاتا پھرتا تھا۔

جرمنی میں بھی یہودیوں سے کچھ اِس سے کم بُرا سلوک نہیں کیا گیا۔ ایک دفعہ جب مَیں یہودیوں کے قدیم معبد کی سیر کر رہا تھا تو میرے ہمراہی نے مجھے ایک قصّہ سُنایا۔ کہ زمانۂ قدیم میں ایک دفعہ صرف اس لئے کہ یہودیوں سے نفرت زیادہ کیجائے۔ ایک مُردہ بچّہ عیسائیوں نے خفیہ طور سے یہودی کے گھر میں ڈالدیا۔ اور سازش کرنے والوں نے فوراً مقدّمہ دائر کیا۔ تفتیش کے بعد بچّہ ملا۔ اور بیگناہ یہودی خُون کے مرتکب قرار دئے گئے۔ شہر کے حاکم نے حکم سُنا دیا کہ اگر قاتل برآمد نہ ہُوا تو یہودیوں کے سربرآوردہ اور معزّز لوگ اُبلتے ہُوئے تیل کے کڑاہے میں ڈالدیئے جائینگے۔ وقت سر پہ آگیا۔ راہب اور دیگر معزّز لوگ گرفتار کرلئے گئے اور انکے اظہار لئے جانے لگے۔ جو اذیّت انہیں دیجانیوالی تھی اسکی تیاری انکی آنکھوں کے سامنے ہونے لگی۔ کہ یکایک دو اجنبی آئے۔ اور اپنے آپ کو مجسٹریٹ کے حوالے کرکے کہا کہ اس جرم کے کرنے والے ہم ہی ہیں۔ اُبلتے ہُوئے تیل میں اُنہیں فوراً جھونک دیا گیا۔ نیک اور پاک دروغ انکے لبوں پر تھا۔ اور بیگناہی نے انکے چہروں کو منوّر کر دیا تھا۔ دوسروں کی جانیں بچانے کے واسطے اپنی جانیں اُنہوں نے خوشی خوشی قربان کر دیں۔

جرمن میں یہودیوں کی خونریزی بھی اسی سال جب بلیک ڈیتھ (طاعون) نے یورپ میں ہلاکت پھیلائی تھی شروع ہُوئی۔

اِس وبا میں یورپ کے ایک چوتھائی آدمی مر گئے۔ لیکن ان مرنے والوں میں یہودیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ جسکی وجہ ایک تو اُنکا علیحدہ اور ایک طرف رہنا اور دوسرے اُنکا سادہ اور صاف طریقہ معاشرت تھا۔ لوگوں کو شُبہ ہوا کہ یہودی کیوں نہیں مرتے۔ اور اس شبہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف قسم کی روایتیں

تراشی گئیں کہ یہودی کنوؤں اور چشموں میں زہر ملا دیتے ہیں اور یہ کہ ٹولیڈو کے راہبوں نے یہ تجویز کی ہے کہ تمام عیسائیوں کو تباہ کر دیں - اس کے ثابت کرنے کی ہر ایک طرح کوشش کی گئی اور ایک غریب کو ایذا دیکر اور اُس پر ظلم کر کے اقرار کرا لیا گیا - بس - یہودیوں پر لوگ ٹوٹ پڑے - اور بہتیروں کو برباد کر دیا - سٹریس برگ میں دو ہزار پھانسی چڑھا دیئے گئے - اور اُنکی لاشیں آگ میں ڈالدیں اور مقامات پر چونکہ اُنہیں اپنی قسمت میں یہ ہی لکھا معلوم ہوتا تھا - یہودیوں نے خود اپنے گھروں میں آگ لگا دی اور خود بھی جلکر خاک ہو گئے -

انگریزی تاریخ سے شروع ہی زمانہ میں یہودیوں کی انگلستان میں موجودگی کا پتہ چلتا ہے - سیکسن اہل برطانیہ سے لڑتے رہے اور اہل ڈنمارک سیکسن سے - مگر یہودیوں کے ساتھ دشمنی متفق علیہ تھی - کینوٹ بادشاہ نے اُنہیں نکالدیا - اور یہاں سے انہوں نے نورمنڈی میں پناہ لی - ولیم فاتح کے زمانہ میں وُہ پھر انگلستان میں چلے آئے - کچھ دنوں تک گو انکے ساتھ یہاں مہربانی سے سلوک کیا گیا - ولیم ثانی خصوصیت سے اُن پر شفیق تھا - اُس نے عیسائی اور یہودی عُلماؤں میں ایک مذہبی مناظرہ کرایا اور قسم کھائی کہ اگر عیسائی مذہب کو شکست ہوئی تو فوراً یہودی ہو جاؤنگا - لیکن یہ عنایات چند روزہ تھیں - رچرڈ اوّل کے زمانہ میں انہیں پھر انہی مصائب کا سامنا پڑا جن سے کچھ دنوں کے واسطے امن مل گیا تھا -

بیوقوف یہودی نئے بادشاہ کی عنایت حاصل کرنے کے خیال میں اسکی تخت نشینی کے دربار میں عمدہ عمدہ لباس پہنکر آئے جن پر قیمتی جواہر جڑے تھے - اس بیدین قوم کی موجودگی ایسے مبارک موقعہ پر فالِ بد سمجھی گئی - ویسٹ منسٹر ایبے سے نکل جانیکا اذن فوراً دیا گیا - لنڈن میں کوئی یہودی گھر ایسا نہ تھا جو قتل و غارت سے بچا ہو - دار الخلافہ

ہیں جب یہ حالت نہ ہو تو باہر ملک میں جتنا ظلم ہو تھوڑا ہے - یورک میں ایک ایسا اندوہناک واقعہ ہوا جسکی مثال صرف یہود ہی کی تاریخ میں مل سکتی ہے - یہودیوں نے اس قلعہ میں پناہ لی - اور جوشیلے عیسائی پادریوں کا مقابلہ کیا - انہوں نے مذہبی جوش کی آگ سب جگہ پھیلا دی اور فتویٰ دیدیا کہ جو شخص ایک بے دین کا خون کریگا بخشا جائیگا - خود صلیب ہاتھوں میں لئے ہوئے لڑتے تھے - تھوڑی ہی دیر کے بعد یہودیوں کو معلوم ہو گیا کہ اب مقابلہ بے سود ہے - یورک کا ایک راہب جو ایک مقدس اور عالم آدمی تھا اپنی قوم سے اس طرح مخاطب ہوا " اے بنی اسرائیل آج ہمارا اور ہمارے باپ دادوں کا خدا اپنے مقدس قانون (کتاب مقدس) کے لئے جانیں دیدینے کا حکم کرتا ہے - اس قانون کی پابندی ہماری قوم نے ابتدا ہی سے کی ہے - اِس قانون کی ہم نے ابتک باوجود ان تمام مصائب کے جو سب قوموں سے ہمیں پہنچے اور باوجود اس مقید حالت کے خوب حفاظت کی ہے - کم سے کم جو ہم کر سکتے ہیں وہ اپنی جانیں کھپا دینا ہے - موت ہماری آنکھوں کے سامنے کھڑی ہے - اگر ہم خود اپنے ہاتھوں سے اپنی جانوں کو خدا کے حوالے کر دیں جیسا کہ ہمارے بزرگوں نے کیا ہے - تو ہم عیسائیوں کی (جو بھیڑیوں کی طرح ہمارے خون کے پیاسے ہیں اور ہمیں دیکھ دیکھ کر غُراتے ہیں) ایذاؤں سے بچ جائینگے - خدا ہمیں بلا رہا ہے - اس کے فضل کا مستحق ہمیں بننا چاہیئے" - یہ ضعیف العمر اس قدر کہکر رو پڑا - رات ہو گئی تھی - محاصرین اپنے ہتھیاروں ہی کی طرف متوجہ تھے کہ قلعہ کے اندر شعلے بلند ہوئے - مردوں نے اپنی بیویوں اور اپنی اولادوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا اور پھر ایک ایک نے ایک دوسرے کو بڑوں نے چھوٹوں کو - اور بڑوں کو اُنکے بوڑھے راہب نے آخر میں وہ اکیلا کھڑا رہگیا - مرد عورت - بچوں بوڑھوں کی لاشیں خاموش اُس کے گرد ڈھیر کے ڈھیر پڑی تھیں - دہکتے ہوئے شعلوں میں نہ صرف مال و متاع

بلکہ لاشیں تک ڈالدی گئیں - ضعیف العمر نے آخرالامر اپنا بھی کام تمام کر ڈالا اور اپنے ساتھیوں میں مل گیا - فاتحین کے لئے صرف ایک خاک کا ڈھیر چھوڑ گیا جو پانسو جانیں تلف ہونے کا نتیجہ تھا -

ایک صدی تک تو باقیماندہ یہودی جس طرح سے بھی ہو سکا انگلستان میں رہے - لیکن ایڈورڈ اول نے جو ایک نیک اور بڑا بادشاہ خیال کیا جاتا ہے - انکو بالکل نکال دیا - ان جلاوطنوں کی تعداد تقریباً سولہ ہزار پانسو تھی - اسوقت سے چار صدیوں تک پھر انگلستان کی زمین پر کسی یہودی کا نقش پا تک بھی نہیں دیکھا گیا - کرومویل نے انہیں پھر اجازت دی مگر بہت سی پابندیوں اور شرائط کے ساتھ -

لنڈن برج کے ایک محراب کے نیچے پانی نہایت زور سے بہتا ہے - دریا میں جس وقت مد و جزر کسی خاص درجہ تک پہنچتا ہے تو پانی ایک عجیب طرح چکر کھایا کرتا ہے - لوگ یقین کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں - کہ پانی کا اس جگہ اس طرح چکر کھاتا بیان کیا جاتا ہے کہ اس محراب کے نیچے گذشتہ زمانہ میں یہودیوں کا ایک گروہ غرق کر دیا گیا ہے اور شور مچانا اسی دن سے شروع ہوا ہے جس دن ان یہود مظلوموں کے مرتے وقت کی چیخیں اس جگہ خاموش کر دی گئیں - گویا پانی بھی جس نے ایک پوشیدہ اور دردناک واقعہ میں حصہ لیا اپنے اوپر پشیمان ہوتا ہے اور اپنی خفیہ پشیمانی کی تکلیف کو آج تک اس صورت میں ظاہر کرتا ہے -

اٹلی میں جو تکلیفیں یہودیوں کو پہنچیں وہ مقابلۃً اور قوموں کے سلوک سے کم خوفناک ہیں - خاص شہر روم میں یہودیوں کی قسمت کا دار و مدار پوپ ہی کی ذات پر محدود ہوتا تھا بعض دفعہ تو وہ نہایت انسانیت سے انکی حفاظت کرتے تھے اور بعض دفعہ اپنی خود غرضی سے انہیں قتل کر ڈالتے یا آگ میں جھونک دیتے - جنوبی حصہ اٹلی میں یہودی خاص طور پر پیشہ ور تھے - رنگریز - معمار - لوہار - سُنار - ریشم کے کام کرنیوالے وغیرہ قریب قریب یہودی ہی تھے -

جس وقت یہودی انگلستان اور جرمنی میں طرح طرح کی مصائب کا شکار بن رہے تھے۔ اُنکے بھائی فرانس میں قابلِ رشک حالت میں تھے۔ شہر و دیہات میں پھیلے ہُوئے تھے۔ کھیتی کرتے تھے باغ لگاتے تھے۔ غرض زراعت۔ دستکاری طبابت اور علم۔ ہر ایک شے میں حصّہ لیتے تھے۔ زیادہ تر تجّار اور ساہوکار تھے۔ آسمان اُن کے موافق تھا۔ اگرچہ کبھی کبھی قتل وغارت کی مصیبت اُن پر بھی پڑجاتی تھی۔ سنہ ۱۱۸۰ء میں جب فلپ اگسٹس تخت پر جلوہ افروز ہُوئے۔ تو یہاں بھی وُہ ہی مثال اختیار کی گئی۔ بادشاہ اور رعایا دونوں نے ملکر چکّی کے دو پاٹوں کی طرح بیرحمی سے یہودیوں کو کچلنا اور پیسنا شروع کیا۔ اُنکے مال ومتاع زبردستی چھین لئے گئے۔ جہاں ایذا دہی سے فائدہ متصوّر نہ ہوتا تو قتل سے کام لیا جاتا۔ حتّی کہ لُٹے کھسٹے جو باقی رہے اُنہیں سرحد سے باہر نکل جانیکا حکم دیدیا گیا۔ مقدس سینٹ لوئیس جسکو تاریخ اور فسانوں نے آسمان پر چڑھا دیا۔ یہودیوں کو چوپایوں کی طرح خرید وفروخت کرتا تھا۔ اور اُسنے اُنکی محبوب اور مقدّس کتاب جو مصائب اور تکالیف میں اُنکی تسکین کا سبب ہوتی تھی زبردستی چھین کر برباد کرتا۔ سنہ ۱۳۰۶ء میں جس دن یروشلیم برباد کیا گیا اُسی دن ایک لاکھ مرد۔ عورت اور بچّے مال ومتاع سب چھین کر بے خانماں مُلک سے نکالدیئے گئے۔

مشہور لیوتھر جو بہت بڑا مذہبی ریفارمر تھا۔ اس کا قول ہے "میرے بھائی عیسائیو! جان لو۔ اور اس میں شک نہ کرو۔ کہ شیطان کے سوا تمہارا کوئی دشمن اس قدر سخت کینہ ور۔ اور زہریلا نہیں ہے جیسا کہ ایک یہودی"۔

(ترجمہ انگریزی) خواجہ لطیف احمد (علیگڈھ)

غور

"تم لوگ غور کو" خدا کہتا ہے "بہت ہی کم کام میں لاتے ہو"۔ اسکی صداقت کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ یہ اُسکا کلام ہے جو انسانی فطرت کا صانع ہے۔ اور بیشک اگر ہم ذرا بھی اپنی حالت پر انصاف کی نظر ڈالیں تو ہم کو صاف معلوم ہو جائیگا کہ ہم اپنی زندگی کی گھڑیاں کس بے پروائی سے گذار رہے ہیں!

ہم دیکھتے ہیں کہ ہم اپنی عمر کا زیادہ حصّہ نقل کرنے میں گذارتے ہیں۔ ہم عام لوگوں کی زندگی کے افعال زیادہ تر دُوسروں سے سیکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو قوّتِ غور کو کام میں لانے والے ہوں۔ اور دُنیا کی کل عمدہ اور لطیف چیزوں کی طرح جہاں اسکی طرف سے بے توجہی اور بے پروائی کی گئی تو یہ قوّت اِس درجہ جلد بوسیدہ ہو جاتی ہے کہ پھر میرا ساتھ دینے سے ہمیشہ مغرور رہتی ہے!

اور اس کے برخلاف اگر اسکی پرورش پر ہمیشہ نظر رہی تو میری زندگی کی اس سے بڑھکر کوئی رفیق نہیں۔ صرف رفیق نہیں۔ بلکہ رہنما اور ہادی!

میری دُنیاوی اور رُوحانی ترقی صرف اسی ایک قوّت کی بدولت ہے۔ جو جتنا زیادہ غور کرنے والا اور سوچنے والا ہوگا اُسی قدر زیادہ پارسا معزّز اور شریف النفس ہوگا ایک غور کرنے والے دماغ کے لئے کسی اُستاد کی ضرورت نہیں۔ وُہ قدرت کی ضخیم کتاب میں سب چیزیں پاتا ہے۔ اُسکو قاہرہ کی ایک ٹوٹی ٹھیکری اور روما کی ایک شکستہ اینٹ وہ سبق سکھلا دینگی جو مشہور مصنفوں کے موٹی کتابوں کے صفحے نہیں سکھلا سکتے! وہ ایک ناشپاتی کے گرنے سے وُہ سبق لے لیتا ہے جسکو صدیاں بڑے بڑے ہولناک پتھروں کے گرنے سے نہ لے سکیں۔ وہ سیاست مدن کے اصُول کو اپنی گھر کی چہار دیواری

میں سیکھ لیتا ہے۔ فوج کی کمان لینا اسکولڑکپن کے بعض شریر کھیل سکھلا دیتے ہیں اور ریل کیسی حیرت میں ڈالنے والی چیز کی ایجاد کو اپنی ایک پُرانی چاء کی کتلی سے سیکھ لیتا ہے!

بیشک اس طرح کی سوچنے والی طبیعتوں پر فطرت کا خاص احسان ہوتا ہے جو دُنیا کو انکا ممنون بنا دیتی ہے! پھر بھی قدرت نے کسی دماغ کو بے سلوک نہیں چھوڑا اور یہ انکی نہایت درجہ احسان فراموشی ہوگی جو اپنے صانع کا شکر نہ کریں۔ یعنی اُس سے کچھ کام نہ لیں۔ دُنیا کے دُہ لوگ جنہوں نے صرف نقل کرنا سیکھا۔ اُنہوں نے کچھ نہیں سیکھا اور خدا کی امانت کا حق بُھلا دیا۔ صانع عالم کی سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ اُس کے بندے "غور" کو کام میں لائیں اور اس طرح اپنے کو اس قابل بنائیں کہ فطرت کی دی ہُوئی قوتوں سے پُورا پُورا دُہ کام لیں جنکے لئے وہ بنائی گئی ہیں۔

لیکن میری جماعت میں ایسی سوچنے والی طبیعتوں کا نہایت ہیبت ناک کال ہے اور بہت ہی قلیل تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنکو ہم سوچنے والا اور غور کرنے والا کہہ سکیں۔ ہم میں اب صرف نقل کرنے والے لوگ رہ گئے۔ میری جماعت میں اب ابو نصر فارابی کیوں نہیں ہوتا؟ رازی اور سینا کے سے لوگ ہم میں اب کیوں نہیں پیدا ہوتے ابنِ خطاب کا سا مدبر ہم میں پھر کیوں نہیں کھڑا ہوتا؟ اس لئے کہ غور کرنے والے لوگ نہ رہے۔ بغداد۔ قرطبہ اور اب اسکندریہ کی دُہ گلیاں نہ رہیں جنمیں ہم زبردست دماغوں کو غور میں ڈوبا ہُوا پاتے ہوں اور جنکی انگلیوں اور ہاتھوں کی حرکت سے دُنیا متحرک ہو رہی ہو!!

جب قدما کا زمانہ ختم ہو گیا تو ہم میں ویسے لوگوں کی کمی ہوتی گئی۔ غور کرنیوالے دماغوں کے چراغ گل ہو گئے اور دفعتاً ملک کے اس سرے سے اُس سرے تک تاریکی دوڑ گئی! جب ہم میں یہ لوگ نہ رہے تو میرے ذخیرہ میں اضافہ ہونا کم ہو گیا اور ترقی کی دوڑ میں ہم پیچھے پڑ گئے۔ ہم میں لوگ تو پیدا ہوتے رہے لیکن کچھ جوہر نہیں دکھلایا

کتابیں تو تصنیف ہوتی تھیں لیکن پُر مغز نہیں - قصّہ گو اور شاعروں کا دریا بہ گیا لیکن حکیم اور مدبّروں کا کال پڑ گیا - عُلما بہت گذر گئے لیکن علمی ذخیرہ کو بڑھا کر نہ گئے - آخر وُہ کونسا زبردست سبب تھا جسکے یہ حسرت ناک نتیجے ہُوئے ؟ قوّتِ غور کیطرف سے بے توجہی !

یہی چیز انسانی ہے جسکی وجہ سے اُسکا اس قدر اعزاز کیا گیا کہ اُس کے صانع نے اُسکو اپنا خلیفہ کہا - اور اُس کے آگے فرشتوں کے سر جھکوائے ! اگر یہ قوّت نہ ہوتی تو ابراہیم اجرامِ فلکی اور خدا میں تمیز نہ کر سکتے !!! یہی قوت تھی جسکی بدولت آمنہ کے یتیم بچے کو رسالت کا مہتم بالشان کام سپُرد ہوا ! - یہ وُہ لوگ ہیں جنکا دماغ بچپن سے لیکر موت تک لگاتار غور میں مصروف رہا -

یہ وُہ قوت ہے کہ جس کی طرف سے بے توجہی کرنی خُدا کے سب سے بڑے فرض کو بھُولنا ہے - ہم اسی لئے بنائے ہی گئے ہیں - غور کرتے کرتے مرجائیں - پالنے سے لیکر موت کی چارپائی تک میرا دماغ لگاتار غور میں مصروف رہنا چاہئے اور میری زندگی کے سارے افعال کہرے غور کے نتیجہ ہونے چاہئیں - ہم اس لئے نہیں بھیجے گئے کہ جو دیکھیں سو کریں بلکہ جو سوچے وُہ کریں - دُنیا میں بڑے بڑے لوگوں کی زندگی قابلِ تتبّع بنائی جاتی ہے لیکن یہ تتبّع نہایت ہی مشکل کام ہے - اُسکی زندگی ہمکو راہ بتا سکتی ہے لیکن چلنا نہیں سکھا سکتی - اور تم کو چلنا سکھانے والی چیز غور ہے ! زمانہ ایک سا نہیں رہتا - وقت ہمیشہ بدلتا رہتا ہے - موقعے کبھی یکساں نہیں رہتے - ان دقتوں میں بھی اپنی ہی پل بوتے سے کام لینا پڑیگا اور وُہ بل بوتے ہمارے غور ہیں -

اگر عاقلانہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہو تو بہت سوچا کرو اور اس لاجواب جوہر دماغ سے وُہ کام لو جسکے لئے وہ بنایا گیا ہے اسکی مشق کرو اور اس میں کمال پہنچاؤ اور اس طرح دُنیا کو اپنے پیچھے کچھ زیادہ سمجھدار چھوڑ مرو !!

غور کرنے کے لئے قدرت کی ضخیم کتاب کے بے شمار صفحے کھلے ہوئے ہیں انکا گہرا مطالعہ کرو اور آنے والی نسلوں کو ممنون کر جاؤ۔ دنیا انہیں کو یاد رکھنے والی ہے۔ جو اُس پر احسان کر گئے۔ لوگ انہیں کی عزت کا گیت گائینگے جو انکو فائدہ پہنچا گئے۔ تاریخ انہیں پر فخر کریگی جو اپنے لگاتار غور کے نتیجہ سے لازوال چیز چھوڑ گئے!!

جزیرہ ساموس پر میری نگاہیں کیوں اس عزت سے پڑتی ہیں؟ اس لئے کہ یہیں سے وہ زبردست فیلسوف نکلا تھا جو دنیا کو زیادہ سمجھ دار چھوڑ کر مرا۔ ایتھنس کے قید خانہ کے گرد دنیا کیوں رو رہی تھی؟ اس لئے کہ ایک عالی دماغ اور خدا ترس شخص کے اعضا وہاں غیر متحرک ہو گئے تھے اور فائدہ جو دنیا کو اسکی ذات سے مل رہا تھا۔ بند ہو گیا تھا! غزالی کے حجرہ کی میری آنکھوں میں کیوں اتنی وقعت ہے؟ اس لئے کہ ایک لگاتار غور کرنے والا یہاں رہتا تھا جواب نہیں رہا؟ محمد کے غار پر میری نگاہیں کیوں اس قدر عزت سے پڑتی ہیں۔ اس لئے کہ ہم جانتے ہیں کہ اسی سنسان جگہ میں ایک معزز دماغ جھکا رہتا تھا۔ جسکی پلکیں غور کے بوجھ سے بند رہتی تھیں!!!

علی محمود (از بانکی پور)

مُعلم النسوان ۔ یہ وہ مفید کارآمد اور نتیجہ خیز لکچر ہے جو ہمارے مکرم خان بہادر میرزا شجاعت علی صاحب نائب ریاست مرشد آباد نے بمقام بمبئی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے گذشتہ اجلاس میں دیا تھا۔ میرزا صاحب کو تعلیم نسواں سے جو خاص دلچسپی ہے وہ کسی بیان کی محتاج نہیں۔ آئے دن انکی کوششوں سے مفید نتائج مترتب ہونے رہتے ہیں۔ اس لکچر میں مرزا صاحب نے نہایت عالمانہ قابلیت سے ضرورت تعلیم نسواں کو ثابت کیا ہے جو صاحب اس لکچر سے مستفید ہونا چاہیں میرزا صاحب کے پاس پتہ ذیل پر درخواست بھیجیں۔ (نمبر ۷ روڈن سٹریٹ۔ شہر کلکتہ)

اجمیر کی جمعرات

اِنسانی زندگی میں بقول ایرانی فلاسفر کے "ہر نفسے کہ فرو میرود ممد حیات است و ہر نفسے کہ برون مے آید مفرّح ذات" کا معاملہ ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ کاہش بھی ہے کہ ہر نفس کے ساتھ زندگی بھی کم ہوتی جاتی ہے اور جو وقت گذرتا ہے وُہ اِس کا مصداق ہے ؎ غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے مُنادی + گردُوں نے گھڑی عُمر کی اک اَور گھٹا دی۔ باوجُود اس کے انسان ہمیشہ آنے والے دِل خوش کن وقت یا دن کا منتظر رہتا ہے۔ ہر وقت یہ خواہش رہتی ہے کہ درمیانی عرصہ جلد ختم ہو جائے اور کوئی بھُولے سے بھی اس بات کا خیال نہیں کرتا کہ اِس طرح گویا وُہ اپنی عُمر جلد ختم ہو جانے کا خواہشمند ہے۔ سینکڑوں آدمی شام اودھ کے اِنتظار میں گھڑیاں گنتے رہتے ہیں اور ہزاروں صاحبدل صبح بنارس کی یاد میں اختر شماری کرتے رہتے ہیں۔ جس طرح ان دو مقامات کے دو خاص وقت دردمندوں کی تسکین کا باعث ہوتے ہیں اسی طرح بعض مقامات کے خاص خاص روز اپنی دلفریبیوں کے باعث اپنے مشتاقوں سے اِنتظار کراتے ہیں چنانچہ اُن میں سے ایک اجمیر کی جمعرات ہے۔

جمعرات کے دن اُس وقت جبکہ دھوپ میں کسی بگڑ کر جانے والے کی دلکش ادا کا نقشہ آجاتا ہے اور وُہ کسی دامنِ ناز بچا کر جانے والے کی طرح لمبے لمبے قدم رکھتی بھاگی ہوئی چلی جاتی ہے۔ شہر کے ہر ایک حصّہ سے سینکڑوں آدمی درگاہِ حضرت خواجہ علیہ الرّحمۃ کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ایک بڑے وسیع میدان میں نہایت شاندار عمارت ہے۔ جس میں متعدّد مسجدیں۔ معابد۔ مزار۔ شاندار مکانات اور بڑے بڑے صحن بنے ہوئے ہیں اور بیچ میں حضرت کا مزار مقدّس ہے جس کے

اوپر ایک رُعب ڈالنے والا طلائی گنبد ہے۔ مزار کے چاروں طرف ایک نُقرئی کٹہرہ ہے۔ مختلف رنگوں کے قیمتی پتھروں کا پچکاری کا فرش ہے اور در و دیوار پر سنہری کام ہو رہا ہے جو ہندوستان کے بادشاہوں اور رؤسا کی فیاضی اور خوش اِعتقادی کا اپنی زبانِ حال سے ثبوت دیتا ہے۔ اِسی طرح بعض مساجد سے سلاطینِ مُغلیہ کی عقیدتمندی کا پتہ لگتا ہے۔ یُوں تو اس عمارت میں ہر وقت ہی ہر مذہب و ملت کے آدمیوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ مگر خاص جمعرات کی شام کو ایک نہایت ہی دلنشین سماں ہو جاتا ہے۔ صدر دروازہ کے قریب آتے ہی دماغ خوشبوؤں سے معطر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہیں گلفروشوں کی بہت سی دُکانیں ہیں جہاں پھول غنچے کے جامہ سے اور غنچے درختوں کے کُنج سے بیقراری کے ساتھ نکل کر اُسی طرح پہنچ جاتے ہیں جس طرح پیاری پیاری صورت والیاں جوشِ جوانی کی ترنگ میں اِشتیاقِ زیارت پُورا کرنے کے لئے درگاہ میں آجاتی ہیں۔ ہر ایک حصّہ میں لوگوں کے غول کے غول خراماں اور سرگرمِ گفتگو دِکھائی دیتے ہیں۔ اِسی طرح دو ایک جگہ دُنیا کی حوروں کے مجمعے ہوتے ہیں اور پھر ساتھ ہی مشتاقانِ دید کے جھمگھٹے جو جمعرات کی حاضری اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ہر ایک دیکھنے میں چاق چوبند اور ساز و یراق میں دلپسند۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت دُنیا کے بیفکرے یہیں جمع ہو گئے ہیں جو باوجود ایسے بزرگ مقدس کے مزار پُر انوار پر حاضر ہونے کے دین و دُنیا کے تفکرات سے فارغ البال ہیں۔ یہ کہنا چاہیئے کہ ناز فروشی و ناز آفرینی اور حُسن پرستی کا بازار لگا ہوا ہے اور کیا تعجب ہے جو دامنِ شرم بھی گُستاخ ہاتھوں کی شوخیوں سے چاک ہو جاتا ہو۔ علاوہ اِنکے اور زائرین بھی جوق جوق آتے ہیں اور اپنی اپنی حیثیت کے موافق چڑھاوہ چڑھاتے ہیں جس کے ذریعہ سے خدّامِ درگاہ کو مفت خوری کے سامان میسر آتے ہیں۔ قبل مغرب دو چار مقامات پر کوئی نہ کوئی خوش الحانی کے جوہر دکھانے

بھی بیٹھ جاتا ہے اور نو خیز و با مذاق طبیعتوں کو کشاں کشاں اپنی طرف بلا لیتا ہے۔ ایک دروازہ کے سامنے کوئی زاہد فریب خواجہ حافظ کے کلام معجز نظام سے دلوں کو ہلا رہا ہے اور ان اشعار کی تکرار ہے ؎

اے فروغِ حسنِ ماہ از روئے رخشانِ شما — آبروئے خوبی از چاہِ زنخدانِ شما
عزمِ دیدارِ تو دارد جان برلب آمدہ — باز گردد یا برآید چیست فرمانِ شما

تو دوسرے دروازہ کے سامنے کوئی باکمال قوال ان اشعار پر صوفیوں کو مرغِ بسمل کی طرح تڑپا رہا ہے۔ ؎

بوئے نافہ کاخر صبا زان طرہ بکشاید — ز تابِ جعدِ مشکینش چہ خون افتاد در دلہا
بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید — کہ سالک بیخبر نبود ز راہ و رسمِ منزلہا
مرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم — جرس فریاد میدارد کہ بربندید محملہا

حجروں اور چھوٹی چھوٹی صحنچیوں میں جاکر دیکھئے تو کچھ مردانِ باخدا تلاوت قرآن اور تسبیح و تہلیل میں مصروف پائے جائینگے۔ غرضکہ انہیں اشغال میں وقت گذر جاتا ہے۔ اور قریب کی مسجد شاہجہانی سے جو سنگِ مرمر کی بنی ہوئی ہے۔ مؤذن اللہ اکبر کی دل ہلا دینے والی آواز بلند کر دیتا ہے اور کچھ لوگ پابندی کے خیال سے اور کچھ شرما شرمی اس سفید عمارت کا راستہ لیتے ہیں اور کچھ اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہو جاتے ہیں۔ اسی وقت "بلند دروازہ" پر جو واقعی اسم بامسمّےٰ ہے۔ نوبت بجائی جاتی ہے۔ جو تمام شہر میں اپنا غلغلہ پہنچا دیتی ہے۔ اور رنگ برنگ کی چڑیاں اڑ اڑ کر ادھر سے ادھر ان عالی شان درختوں پر بیٹھتی جاتی ہیں جو احاطہ درگاہ میں واقع ہیں اور دُور دراز کا سفر طے کئے ہوئے زائرین کو آرام پہنچاتے ہیں۔ انکا چہچہا کر باتیں کرنا اور ایک شاخ سے دوسری شاخ پر بیٹھنا کچھ ایسا بھلا معلوم ہوتا ہے کہ جن پتلی شاخوں پر وہ بیٹھتے ہیں وہ خود بھی خوشی سے جھومنے لگتی ہیں۔ اور انکے پروں سے مختلف

آوازیں باجے کی طرح نکلتی ہیں جن میں زیر و بم کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

بعد نماز سب سے پہلے گنبد مزار مبارک کے اندر روشنی ہوتی ہے اور چند لوگ شمعیں اپنے سروں پر رکھکر کچھ فارسی اشعار حضرت اقدس کی تعریف میں پڑھتے ہیں جن میں یہ بار بار آتا ہے ؎

خواجۂ خواجگاں معین الدّیں اشرفِ اولیائے رُوئے زمیں

اِس کے بعد تمام درگاہ میں جمعرات کی غیر معمولی روشنی ہوتی ہے۔ جا بجا جھاڑ قندیلیں اور فانوس لٹکائے جاتے ہیں۔ جو وصل نصیب عشاق کے دل کے کنول کی طرح روشن ہو جاتے ہیں۔ اور اب تمام عمارت ایک بُقعۂ نُور معلوم ہوتی ہے۔ جب تاروں کی گلکاری آسمان کو کسی کی جبینِ ناز بنا دیتی ہے اور جب وہ مُنہہ بند کلیاں جنہوں نے روز روشن میں ذرا ذرا مُسکرا کر عنادل میں ایک شور برپا کر دیا تھا اور وہ شرمیلے غنچے جنہوں نے دن میں تھوڑا سا نقاب اپنے مُنہہ سے سرکا کر دیکھنے والوں کو اپنی پیاری دلفریب نازک صُورت کی طرف متوجّہ کر لیا تھا پھُولوں کی طرح کھِل جاتے ہیں یعنی تقریباً آٹھ بجے پھر لوگوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے۔ خاصکر عورتوں کا ایک مجمع کثیر ہو جاتا ہے۔ جنکی پردہ داری رات کی سانولی سُہانی تیرگی اچھّی طرح کرتی رہتی ہے۔ مگر شوقین لوگ ہیں کہ وہ بار بار اسی انبوہ میں ہو کر گذرتے ہیں۔ جب کافی مجمع ہو جاتا ہے تو مزارِ مُبارک کے صدر دروازے کے سامنے مجلس حال و قال منعقد ہوتی ہے جسکو ایک شاہی دربار کا نمونہ بنانے کی کوشش کیجاتی ہے۔ سجادہ نشین صاحب نہائت تزک و احتشام کے ساتھ جلوہ افروزِ مجلس ہوتے ہیں اور چوبدار و نقیب اپنے اپنے قرینے سے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف صوفیاء کرام کا جماؤ ہوتا ہے اور دُوسری طرف عوام کا۔ اور قوالی شروع ہو جاتی ہے ؎

سخی سرکار ہے تیری - معین الدین اجمیری
تیرے دربار جو آوے - مرادیں دل کی وہ پاوے

یہ اشعار ہیں جو بہت سے صافی دلوں کو مرغِ بسمل کی طرح تڑپا دیتے ہیں - یہ ایک باقاعدہ جلسہ ہوتا ہے - جس کے متعلّق کچھ ضوابط مقرر ہیں جو مقرّرہ متوسلینِ درگاہ کو (نہ کہ عوام کو) مٹھائی تقسیم ہونے کے بعد برخاست ہو جاتا ہے - اور لوگ اپنے اپنے کارنامے بیان کرتے ہوئے گھروں کو چلے جاتے ہیں اور گویا اُسی وقت سے آنے والی جمعرات کا انتظار شروع ہو جاتا ہے - ؎

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

یہ مختصر حالات ہیں اجمیر کی جمعرات کے جبکہ ایک غیر معمولی چہل پہل ہو جاتی ہے - اور جس سے متعلقینِ درگاہ کو ایک معقول رقم ملجاتی ہے - کیونکہ اُنکو روشنی وغیرہ میں کچھ خرچ کرنا نہیں پڑتا بلکہ اسکا بار خزانہ درگاہ پر ہے جو جائداد موقوفہ کی آمدنی اور ہز ہائی نس نظام کی دریا دلی سے معمور ہوتا ہے - اِس آمدنی سے رفاہ عام کے کام بھی انجام پذیر ہوتے ہیں جیسے شفاخانہ و مدرسہ - مگر انکی حالت بھی ایسی ہی ہے جیسی انتظامِ جائدادِ وقف کی یا مسلمانوں کے اوقاف کی - زیادہ افسوس اسکا ہے کہ یہ آمدنی بھی مسلمانوں کو مُفت خوری کا عادی بناتی ہے جس مرض کی وجہ سے قوم کی تباہی یقینی ہے -

اگر زندگی باقی ہے تو آیندہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمۃ کے تاریخی حالات جو نہایت دلچسپ ہیں ہدیہ ناظرین کئے جاوینگے - کیونکہ جو کتابیں سوانح عمری کی لکھی گئی ہیں میرے خیال میں اُن میں سے کوئی افراط و تفریط سے خالی نہیں ہے - علاوہ اسکے بوجہ انتہائی عقیدتمندی بہت سی باتیں خلافِ قیاس اُن میں درج کر دی گئی ہیں - یار زندہ و صحبت باقی +

نیاز احمد (از میرٹھ)

تاریخِ کوہ نور

لاہور کے عجائب خانہ کے اس ہال میں جہاں صوبہ کی صنعت و حرفت کے نمونہ دھرے ہوئے ہیں - بائیں طرف لاٹانی ہیرے کوہ نور کا کٹڑ کا تراشا ہوا نمونہ موجود ہے - ایک وقت میں یہ ہیرا ہندوستان کے سابقہ فرمانرواؤں کی زیب و زینت رہ چکا ہے - یہ وہی مشہور ہیرا ہے جس کو مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنے بازو میں پہنا کرتا تھا اور سنہ ۱۸۵۱ء کی ہائیڈ پارک کی نمائش گاہ میں اسکو اوزلر صاحب نے پیش کیا تھا -

اِس مشہور ہیرے کی تاریخ بہت سے مبالغہ آمیز قصّوں کے سبب سے کالعدم ہوگئی ہے - ہندوؤں کے افسانوں کے مطابق یہ پایا جاتا ہے کہ یہ ہیرا مہابھارت کے مشہور ہیرو راجہ کاما کی ملکیت تھا - جو تقریباً (۳۰۰۰) تین ہزار برس قبل مسیح راج کرتا تھا - ایرانی یہ کہتے ہیں کہ یہ ہیرا مع دریائے نور کے بادشاہ افراسیاب اپنے تن پہ درباری جلوسوں کے موقعوں پر زیب کرتا تھا -

دریائے نور بھی ایک مشہور ہیرا ہے جو کہ وزن میں ۱۸۶ قیراط ہے شاہنشاہ ایران کے خزانے میں اب تک موجود ہے اور دنیا میں بیش بہا جواہر ہے - اِس کے بعد اسکا کچھ پتا نہیں چلتا لیکن ایک عرصہ کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ یہ گوالیار کے مشہور راجہ بکرماجیت کے قبضے میں آیا جسکو سلطان ابراہیم لودھی نے پانی پت کی مشہور لڑائی سنہ ۱۵۲۶ء میں اپنی مدد کے لئے بلایا تھا اور آخر کار بڑی جوانمردی سے لڑکر سلطان کے پہلو میں جان دی - اسوقت اس راجہ کا کنبہ اور اس کی نسل کے دوسرے سردار ابراہیم کے نام سے شہر آگرہ پر قبضہ کئے ہوئے تھے - فتح کے بعد جب بابر نے ہمایوں کو دارالسلطنتِ آگرہ کو حاصل کرنے کے لئے روانہ کیا

تو ہمایون نے بڑی مہربانی سے اس خاندان کو لوٹ اور غارت سے بچایا اور اُنکے ساتھ اچھا سلوک کیا۔

انھوں نے اس کے تشکریہ میں بہت سے قیمتی زیورات اور جواہرات اور بیش قیمت پتھر گذرانے ۔ سلطان ظہیر الدین بابر بادشاہ لکھتے ہیں۔ انکے درمیان ایک ہیرا تھا جسکو سلطان علاء الدین نے حاصل کیا اور ایسا بیش قیمت تھا کہ جوہریوں نے اس کے نرخ کا اندازہ دنیا کا آدھا روزانہ خرچ خرچ لگایا۔ اسکا وزن آٹھ مثقال یا ۳۲۰ رتی ہے۔ جب میں آگرہ پہنچا تو ہمایون نے پیشکش کے طور پر حاضر کیا اور میں نے اسکو اپنے بیٹے ہی کو واپس کر دیا۔

یہ ہیرا جب راجہ بکرماجیت کے خاندان نے ہمایون کو حوالے کیا تو ہم کو معلوم ہوا کہ ہندو راجہ کے پاس سے آیا۔ لیکن بابر کے حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکو سلطان علاءالدین نے سنہ ۱۳۰۴ء میں حاصل کیا لیکن پھر یہ پتا نہیں لگتا کہ یہ مسلمانوں سے نکل کر کس طرح ہندو راجہ کے قبضہ میں آیا۔ تاہم سلطان بابر کے حوالے سے جو ایک باریک بین شہنشاہ تھا۔ ہم یہی رائے قائم کرتے ہیں کہ اسکو خلجی شہنشاہوں نے قریباً دو صدی پہلے ہی ہندو مالکوں سے لے لیا تھا تب سے برابر مسلمانوں کے قبضہ میں رہا۔ در اصل یہ ہیرا اسوقت ابراہیم لودھی کی ماں نے شہنشاہ کو پیش کیا تھا۔

ایک ہیرا جسکو ڈاکٹر برنیر نے لاثانی کہا ہے بادشاہ شاہ جہان غازی کو میر جملہ نے نذرانا جو کہ اس سے پہلے عبد اللہ قطب والی گولکنڈہ کا وزیر تھا اور جواہرات کا سوداگر بھی تھا۔ اور آخر کار کسی سبب سے رنجیدہ خاطر ہو کر شاہجہان کی طرف جا ملا ۱۶۵۶ء میں گولکنڈہ کی فتح کے لیئے امیر جملہ نے فوج کی کمان افسری پانے پر یہ لاثانی ہیرا شاہ جہان کے حضور میں پیش کیا۔

اب یہاں یہ حیرانی ہوتی ہے کہ کس طرح مغلوں کے ہاتھ سے نکل آیا اور میر جملہ کے

پاس پہنچا لیکن یہ شبہ کچھ اس طرح دُور ہوجاتا ہے کہ جب ہمایُون ایران کو بھاگا تو پیچھے انقلابِ زمانہ سے یہ دکن کے فرمانرواؤں کے قبضہ میں پہنچا۔ اور اسی طرح سے میر جملہ نے اپنے قابو میں کر لیا ہوگا۔

بعض مصنّف لکھتے ہیں کہ ہیرا کوہ نُور میر جملہ نے گولکنڈہ کی کان میں پایا تھا اور وہ ہیرا جسکا حال بابر نے لکھا ہے وُہ اَور ہے لیکن یورپین سیاحوں نے یہی رائے قائم کی تھی۔ کہ یہ قدیم ہیرا ہے مثلاً ارسکن پروفیسر مسکیلین اور جنرل کننگ ہم وغیرہ سب اسی بات پر متفق ہیں کہ گریٹ مغل ڈائمنڈ جس کا حال ٹیورنیر نے بیان کیا ہے وہی ہے جسکا ذکر شہنشاہ بابر نے کیا ہے"۔

سنہ ۱۶۶۵ء میں اورنگ زیب نے اپنے شاہی خزانہ کے زیورات ایک فرانسیسی جوہری سوداگر ٹیورنیر نامی کو دکھلائے جس میں اس کے بیان کے مطابق اس نے ایک ہیرا دیکھا کہ جو وزن میں ۳۱۹ رتی تھا۔ اس ہیرے کو ٹیورنیر مغل اعظم کے ہیرے کے نام سے پکارتا ہے اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ یہ وہی ہیرا ہے کہ جسکو ڈاکٹر برنیر نے لاثانی کہا ہے۔ اور بابر کا ہیرا جسکا حال تذکرہ بابری میں ہے۔ اس کا وزن جتنا کہ ٹیورنیر نے جانچا ہے ٹھیک بابر کے تذکرہ سے منطبق ہے۔ ٹیورنیر لکھتا ہے کہ مغل اعظم کا ہیرا وزن میں ۳۱۹½ رتی ہے۔ اسکی چمک نہایت ہی شفاف خالص پانی کی سی ہے۔ وضع نہایت خوبصورت صرف کنارے پر ایک چھوٹا سا چپٹا داغ ہے۔ وہ اس ہیرے کی قیمت ۱۸ شلنگ۔ ۸۷۹۲۴۵ پونڈ کا تخمینہ لگاتا ہے۔

سنہ ۱۷۳۹ء میں جب نادرشاہ نے دہلی کو لُوٹا تو اُس نے شاہی جواہرات میں اسکو دیکھ کر کوہ نُور کا لقب دیا جو ایک نہایت ہی مناسب نام ہے یہ تاریخ میں پہلا واقعہ ہے کہ ہیرا خاص نام سے پکارا گیا۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ یہ ہیرا نادرشاہ کو محمد شاہ شہنشاہ دہلی سے بھائی چارہ کے طور پر پگڑی بدلتے ہوئے ہاتھ لگا۔ لیکن دیگر مورخ اس

واقعہ کو بالکل غلط بتاتے ہیں۔

جب نادر شاہ نے ۱۷۴۷ء میں فتح آباد علاقہ خراسان میں وفات پائی تب یہ ہیرا مع تخت کے علی قُلی خاں عُرف علی شاہ کے تصرّف میں آیا جس نے نادر کو سر ولیم جان کے تذکرہ کے مطابق اپنے چچا کا تاج اور تخت حاصل کرنے کے لئے قتل کیا تھا۔

علی شاہ کے اندھا کئے جانے اور تخت سے اُتارے جانے کے بعد یہ ہیرا نادر شاہ کے پوتے شاہ رُخ مرزا کے پاس آیا جو مشہد میں اپنے محل میں کنارہ کش ہو گیا وہاں اُسکو آغا محمد خاں بانیٔ خاندان قاچار نے قید کر کے کوہ نور حاصل کرنے کی غرض سے نہایت سخت تکلیف دی۔ لیکن لاحاصل۔

پھر ۱۸۱۱ء میں شاہ رُخ مرزا نے احمد شاہ دُرّانی کو اسکی خدمات کے عوض میں عطا کیا۔ احمد شاہ کے مرنے کے بعد یہ اس کے بیٹے جانشین تیمور شاہ کی میراث میں آیا۔ جب اس کی بھی رحلت کا وقت قریب آیا تو اُس نے یہ اور مع شاہی جواہرات کے اپنے بڑے بیٹے شاہ زمان کو سونپا۔ آخر کار اُسکو بھی اس کے بھائی محمد شاہ نے اندھا کر کے تخت سے اُتار دیا۔ لیکن ہیرے کو اُس نے ایک تدبیر کے ساتھ حفاظت میں رکھا۔ پھر یہ اس کے بھائی شاہ شجاع کے قبضہ میں آیا۔ مسٹر المینفسٹون کے بیان کے مطابق یہ ہیرا مع دیگر جواہرات کے حجرے کی اس دیوار کے اندر مخفی کیا ہوا پایا گیا تھا۔ جس میں زمان شاہ مقید تھا۔ جب مسٹر موصوف نے شاہ شجاع سے پشاور میں ملاقات کی تو اُس نے شاہ شجاع کے بازو میں پہنا ہوا دیکھا۔ اور اشارہ سے بتاتا ہے کہ یہ وُہی ہیرا ہے جس کا ذکر ٹیورنیئر نے کیا ہے۔

جب ۱۸۱۳ء میں شاہ شجاع اپنی بیوی وفا بیگم کے ساتھ مدد کے لئے لاہور آیا تو رنجیت سنگھ نے جو کہ اخیر عمر میں خزانہ کے جمع کرنے کی بڑی ہوا و ہوس رکھتا تھا۔

شاہ شجاع کو تین لاکھ روپیہ نقد پچاس ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر اور کابل کا تخت حاصل کرنے کے لئے مدد دینے کے وعدے پر اسکو کوہ نور کے دینے پر مجبور کیا۔ یہ دلچسپ واقعہ جس کے سبب شاہ شجاع ہیرا دینے پر مجبور ہوا۔ اُن لوگوں نے جنہوں نے اپنی آنکھ سے مشاہدہ کیا ہے۔ اِس طرح بیان کیا جاتا ہے۔

یکم جون سنہ ۱۸۱۳ء کو مہاراجہ نے فقیر عزیز الدین۔ بھائی گوربخش سنگھ اور جمعدار کھوسلا سنگھ کو شاہ شجاع کے پاس ہیرا طلب کرنے کو بھیجا۔ شاہ نے جواب دیا کہ مہاراجہ کو بذاتِ خود آنا چاہیے۔ اس خوشخبری کے سُننے میں مہاراجہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا۔ دائیں اور بائیں سواروں کو بطور باڈی گارڈ کے لیکر اور ایک ہزار روپیہ نقد اپنی ہمراہ رکھ کر شاہ کے رہنے کی جگہ مبارک حویلی کو روانہ ہوا۔ شاہ نے نہایت افتخار کے ساتھ مہاراجہ کا استقبال کیا۔ دونو بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔

آخر کار مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بے قرار ہوکر اپنے ایک مُلازم کے کان میں شاہ کو مُلاقات کی غرض جتانے کے لئے کہا۔ نوکر نے حکم کی تعمیل کی۔ شاہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن اپنے ایک نوکر کو آنکھ سے اشارہ کیا اور تھوڑی دیر کے بعد دریدہ جامہ میں کچھ لپیٹا ہوا لایا۔ اور برابر برابر فاصلہ سے دونوں کے بیچ میں رکھ دیا۔ آپس میں دوستی قرار دی گئی اور دونوں کے درمیان بھائی چارہ کے طور پر پگڑی بدل ہوئی ہیرا کھولا گیا۔ رنجیت سنگھ نے اسکو پہچان کر اس ہیرے کی قیمت دریافت کی۔ شاہ نے جواب دیا۔ کہ اس کی قیمت لاٹھی ہے۔ میرے باپ دادا نے اِسی طرح سے حاصل کیا۔ اور تم نے مجھ سے بہت تکلیف کے بعد قابو کیا۔ اور تمہارے بعد ایک اور بادشاہت قائم ہوگی اور اسی طریقوں سے تم کو بھی اس سے محروم کریگی۔ مہاراجہ نے اِس کلام سے کوئی غصہ نہیں کھایا۔ اور چپکے سے جیب میں ڈال کر محل کو روانہ ہوگیا۔

محل میں داخل ہونے کے بعد مہاراجہ نے ایک بڑا دربار منعقد کیا اور شہر میں

اس موقع کی یادگار میں روشنی کی گئی ۔ لیکن بدبخت اور مقید شاہ شجاع کے تنگ و تاریک قیدخانہ میں ایک بھی چراغ نہ جلایا گیا ۔ وہ وعدہ جو مہاراج نے شاہ شجاع سے کیا تھا ۔ کبھی وفا نہ ہوا ۔

موت سے دو گھنٹے پہلے رنجیت سنگھ نے اپنے تمام جواہرات لانے کا حکم دیا ۔ اور دیگر خیرات میں اُس نے اپنی عاقبت کی خیر کے لیئے یہ وصیت کی کہ کوہ نور ہیرا جگن ناتھ مندر میں بُت کی زیبائش کے لیئے بھیجا جائے ۔ اور اپنے ہاتھ سے پانی چھڑکنے کی آرزو کی ۔ جو کہ ہبہ نامہ کا ایک نشان ہوتا تھا ۔ لیکن بیلی رام مہتمم توشہ خانہ نے اس وجہ سے کہ یہ بھی حق وارث کا حصہ ہے ۔ اس کے برآمد کرنے سے انکار کیا ۔ کھڑک سنگھ اور نونہال سنگھ کے مرنے کے بعد جب شیر سنگھ پنجاب کا راجہ قرار دیا گیا ۔ تو گلاب سنگھ نے اپنے نئے مہاراجہ کو مبارکباد دی اور آداب بجالا کر خود اپنے ہاتھ سے مہاراجہ کو کوہ نور دیا ۔

۱۸۴۹ء میں جب سرکار انگریزی نے پنجاب کو فتح کیا اور دلیپ سنگھ تخت سے دست بردار ہوا تو قاعدہ کے مطابق بورڈ آف ایڈمنسٹریشن کو دیا ۔ جا کر جان لارنس کی حفاظت میں رکھا گیا ۔ بوسورتھ سمتھ لارڈ لارنس کی سوانح عمری میں کوہ نور کا عجیب واقعہ بیان کرتے ہیں ۔

جان لارنس جسکو کہ دُنیا کے آرام بخوبی میسر تھے ۔ دولت کی طمع سے ایک لاپروا شخص تھا ۔ اور کبھی شاذ و نادر ہی اپنے کوٹ اور کالر کی درستی میں التفات کرتا تھا ۔ اس موقع پر جب ہیرا اسکو سپرد کیا گیا تو اُس نے نہایت ہی لاپروائی سے ایک ٹین کی چھوٹی سی ڈبیا میں بند کر کے جیب میں ڈال لیا ۔ اور اس خیال کو فراموش کر دیا ۔

چھ ہفتے کے بعد لارڈ ڈلہوزی کے پاس سے ایک پیغام آیا کہ وہ ہیرا ملکہ معظمہ قیصرہ ہند کی خدمت میں روانہ کیا جائے ۔ یہ مضمون پڑھ کر جان لارنس صاحب

نہایت پریشانی اور اضطراب کی حالت میں دوڑے ہوئے گھر میں آئے۔ جاتے ہی اپنے ایک پرانے خدمتگار کو بلایا۔ کہ تھوڑا عرصہ ہوا۔ دل! کیا تم نے ایک ڈبیا جو کہ میری پاکٹ میں تھی۔ دیکھی ہے؟

اُس نے کہا ہاں صاحب ڈبیا کو مَیں نے آپکے ایک صندوق میں رکھا ہوا ہے۔ جان لارنس صاحب نے اسکے لانے کا حکم دیا۔ نوکر دوڑا ہوا لایا۔ صاحب نے کہا کہ اسکو کھولو۔ کھولا گیا تو پُوچھا کہ کیا ہے؟ کہا صاحب کچھ نہیں ہے۔ مگر ایک کنکر کا ٹکڑا ہے۔ تب جان لارنس کی پریشانی دُور ہُوئی۔ ۱۸۵۲ء میں یہ آٹھ ہزار پونڈ کی لاگت سے پھر تراشا گیا۔ جس طریقہ سے کہ ہیرا رنجیت سنگھ نے شاہ شجاع سے حاصل کیا بخوبی معلوم ہو گیا ہے۔ شاہ شجاع جو کہ سکھ دربار پر بھروسہ کر کے مہمان ہو کر آیا۔ یہاں اس بدبخت مظلوم کے ساتھ یہ سلوک ہُوا۔ کہ زندان میں مقید کیا گیا۔ اور بجائے اس کے کہ اسکی مدد کی جاتی اور اسکو کابل کا تخت دلایا جاتا اس کے ساتھ یہ واقعہ ہوا کہ اسکو اپنی ہی پونجی سے محروم کر دیا۔ اور اُس نے اس مشرقی ملکوں کی قدیم رہنموئی کا خیال نہ کیا۔ کہ مہمان کی کیا خاطر مدارات ہونی چاہیے۔ نہیں نہیں۔ بلکہ اُس نے اس کے برخلاف انکو توڑ کر اپنے نام پر سخت دھبا لگایا۔ شاہ موصوف آخر کار اپنی دانشمندی سے قید خانہ سے بچ کر سرکار انگریزی کے پاس لودیانہ مدد کے لئے چلا آیا۔ جہاں کہ مہربان گورنمنٹ نے اس کے ساتھ نہایت اچھی طرح سے سلوک کیا۔ اور اس کی ہر طرح سے مدد کی۔

آجکل یہ بیش قیمت ہیرا ہماری فیاض مہربان گورنمنٹ انگریزی کے پاس ہے جو کہ اب اُس ملک کی برحق وارث ہے۔

ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت رفت و منزل بدیگرے پرداخت

خیال ہونا چاہیے کہ یہ ہیرا جسکی عمر سند و افسانوں کے مطابق چار ہزار برس ہوتی ہے کسطرح دست بدست شہنشاہوں کے قبضہ میں آیا۔ لیکن اسکی قابض زندہ نہ رہے۔ اور حسرت اور ناامیدی کے ساتھ دُنیا سے کُوچ کر گئے۔

(سید جعفر حسین)

پروازِ وقت

کہاں ہیں وہ گذشتہ نسل کے لوگ جو ہماری طرح اس ہستی کی نمائشی بھڑک کے پیچھے دواں۔ اپنے کام میں کوشاں سلطنت اور امورِ ملکی کی تجاویز میں مستغرق صراط مستقیم سے گم گشتہ اور دل آویز باتوں کے فدائی تھے؟ کہاں ہیں وہ لوگ جو چند ہی سال ہوئے اس مصروفِ تماشا گاہِ ہستی کے محرک اور روحِ رواں تھے؟ کہاں ہیں وہ کسان جو اس زمین پر رہتے تھے جہاں اب تم ہو؟ کہاں ہیں وہ پسینے بہانے والے مزدور جو کبھی تمہارے گھروں اور گاؤں کے مکین تھے؟ کہاں ہیں وہ واعظ جو نیکی کے سبق کی تلقین کرتے تھے اور اس دنیا کی نمائشوں سے خبردار؟ اور کہاں ہیں وہ لوگ جو اپنے متبرک دنوں میں طلبِ عبادت پر ان مکانوں میں آ جمع ہوتے تھے۔ جس جگہ اب تم متمکن ہو؟ آہ! اب انکی جائے سکونت بے مہر قبر ہے۔ یعنے فراموشی اور سکوت کی دنیا! اُنکے نام تک بھی صفحہ ہستی سے مٹ گئے ہیں اور انکے اپنے ہی بچے انہیں اپنی یاد سے بھلا بیٹھے ہیں۔ انکے ہاتھوں کی محنت شاقہ یا تو خس وخاشاک کے نیچے دب گئی ہے اور یا زمانہ کے ظالم ہاتھوں نے اُسے بالکل ویران کر دیا ہے۔ ہم انہی آباو اجداد کی اولاد ہیں اور اس حیرت انگیز اور پُر ہیبت نصیبے کے وارث یہ وقت جس میں میں رہتا ہوں۔ دنیا کی اس بڑی تواریخ کا ایک لمحہ ہے۔ جو سایۂ کی تیز روی ہے اور عارضی خوشی کا خواب۔ یہ شہابِ ثاقب کی ایک فوری جھلک ہے اور ایسا نازک پھول ہے جو آسمان کی ذراسی تیوری سے بھی مرجھا جاتا ہے۔ یہ ایسی کہانی ہے جسکی یاد یونہی فراموش ہو جاتی ہے۔ اور یہ ایسا دن ہو جسکو شبِ دراز کا سکوت دھندلا اور تاریک کر دیتا ہے۔ تھوڑے ہی سالوں کے بعد ہمارے سر

اس سرزمین کو سونپ دی جائینگے اور سبزہ انکا قبر پوش ہوگا۔ آئندہ نسل کے لیے ہماری قبریں جولانگاہ ہونگی۔ وُہ ہمارے لئے چند اک دن روتے رہینگے۔ چند اک مہینے ہماری باتیں بھی کیا کرینگے اور چند اک سال یاد بھی رکھینگے پھر اس کے بعد ہمارا نام اِس دار ہستی سے مِٹ جائیگا اور کوئی نام لیوا تک بھی باقی نہ رہیگا۔

تمام دل آویز بیانوں میں سے یہ بات مجھ پر بہت اثر کرتی ہے کہ ایک صدی کے بعد یہ دُنیا پھر ایسی کی ایسی ہو جائیگی"۔ لوگ اِسے بسا اوقات ضرب المثل کے پیرائے میں ایسی دِل لگی کے ساتھ جو اسکی وقعت سے آگاہ نہیں ہے اِستعمال کرتے ہیں۔

ایک سو سال بعد۔ اللہ اکبر! کس تیزی سے یہ صدی اپنے اختتام پر آئیگی۔ آجکا دن ڈھل جائیگا اور اِس طرح کے کچھ دن ایک سال بنجائینگے۔ پھر سال کے بعد سال گذریگا اور کچھ سال ایک صدی بنجائینگے۔ یہ تھوڑا سا وقفہ وقت کا مجتمع ہو کر اس عظیم عرصہ روزگار کو بھر دیگا۔ جو تصوّر کی نظروں میں اتنا دراز اور لا انتہا نظر آتا ہے۔

آنیوالی صدی اس تباہی کو دیکھیگی۔ ہر ایک جاندار چیز جو آج نظر آتی ہے دُنیا سے نابود ہوگی۔ وُہ معصوم بچّہ جو ماں کی چھاتی سے لپٹا ہوا ہے۔ صرف اپنے پوتوں کی یاد ہی رہجائیگا۔ زندگی اور شعور کا یہ منظر جو میرے روبرو ہے تاریکی اور نفرت انگیز جگہ سے مبدّل ہو جائیگا۔ وُہ لوگ جو میری آواز اب سنتے ہیں۔ خود بھی بولنے سے عاری ہونگے۔ انکی یاد اس صفحہ ہستی سے مِٹ چکی ہوگی اور اُنکا جسم حشرات الارض کی مہمانیوں میں صرف ہو گیا ہوگا اور کیڑے مکوڑوں کی اُنپر بسر ہوگی۔ امتداد زمانہ انکی تابوتوں کو برباد کریگا اور انکی ہڈیاں نئی قبروں کے ایک طرف پھینکدی جائینگی۔ کیا یہی سب چیز ونکا انجام ہے؟ کیا یہی مآل کار ہے انسان کا؟ اور کیا یہی اختتام ہے اسکی مصروف زندگی کا؟ کیا بجز وقت اور قبر کے کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو اس مایوسی بھری تصویر کی مایوسی کو کم کر سکے اور ان وحشتناک خیالوں کو دُور کرے؟ کیا ہم ضرور ہمیشہ کے لیے خاک میں سوئینگے اور اس آسمانی روشنی کو دائمی الوداع کہہ جائینگے؟

(ترجمہ)

نور

چاند

اے قمر کیا خامشی افزا ہے تیری روشنی — رات کے دامن میں ہے گویا سحر سوئی ہوئی
میرے ویرانے سے کوسوں دور ہے تیرا وطن — ہے مگر دریائے دل تیری کشش سے موجزن
حسن کامل تیری صورت کا نشاط انگیز ہے — چاندنی میں تیری اک تسکین غم آمیز ہے
قصد کس محفل کا ہے آتا ہے کس محفل سے تو — زرد رو شاید ہوا رنجِ رہِ منزل سے تو
گھر بنایا تو نے گو ہنگامۂ ہستی سے دور — چاندنی تیری نہیں انسان کی بستی سے دور

ہاں اتر آ میرے دل میں ساتھ لیکر چاندنی
اس اندھیرے گھر میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی

آفرینش میں سراپا نور تو ظلمت ہوں میں — اس سیہ روزی پہ لیکن تیرا ہم قسمت ہوں میں
آہ! میں جلتا ہوں سوزِ اشتیاقِ دید سے — تو سراپا سوز داغِ منتِ خورشید سے
ایک حلقے پر اگر قائم تری رفتار ہے — میری گردش بھی مثالِ گردشِ پرکار ہے
زندگی کی رہ میں سرگرداں ہے تو حیراں ہوں میں — تو فروزاں محفلِ ہستی میں ہے سوزاں ہوں میں
میں رہِ منزل میں ہوں تو بھی رہِ منزل میں ہے — تیری محفل میں ہے جو سنسان میرے دل میں ہے
تو طلب خو ہے تو میرا بھی یہی دستور ہے — چاندنی ہے نور تیرا عشق میرا نور ہے
انجمن ہے ایک میری بھی جہاں رہتا ہوں میں — بزم میں اپنی اگر یکتا ہے تو تنہا ہوں میں
مہر کا پرتو ترے حق میں ہے پیغامِ اجل — محو کر دیتا ہے مجھ کو جلوۂ حسنِ ازل
پھر بھی اے ماہ مبیں میں اور ہوں تو اور ہے — یعنے میں صیاد ہوں جسکا وہ آہو اور ہے
گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں سراپا نور تو — سینکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو

جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے

اقبال

قصیدۂ مدحیہ

(بتقریبِ سالگرہ حضور ملکِ معظم شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم دام ملکہٗ واقبالہٗ)

دیکھ لے قادرِ بے چون و چگوں کی قدرت
گنجِ وحدت میں جو منظور ہو سیرِ کثرت

آسماں رنگ بدلتا ہے زمیں پر کیا کیا
رنگ لاتی ہے نئے۔ روز زمیں کی حرکت

صفحۂ دہر پہ جم جاتے ہیں کیسے نقشے
بنتی ہے عالمِ ایجاد کی کیسی صورت

دھوپ چھاں کا ہے دوپٹہ کبھی انعامِ زمیں
کبھی چادر ہے ستاروں کی فلک کا خلعت

کہتے ہیں جسکو جہاں ہے وہ طلسمِ نیرنگ
ایک سی رہتی ہی نہیں اس میں کسی کی حالت

ہے لڑکپن کو کبھی جوشِ جوانی کی خوشی
کبھی پیری کو جوانی کی ہے تازہ حسرت

آج ہے نوش جسے نیش اُسے کل ہوگا
آج عشرت ہے تو موجود ہے کل کو عسرت

چشمِ بینا کو ہیں موجود مثالیں۔ لاکھوں
کروٹیں لی ہیں زمانے نے بدلکر رنگت

اِک زمانہ تھا کہ بابل کو تھی حکمت کی چاہ
اک زمانہ تھا کہ ارمن کی تھی کامل صنعت

کبھی غلبہ تھا عرب کا کبھی تھا اوجِ عجم
رُوم کو تھی کبھی یونان پہ حاصل سبقت

عرشِ تھی علم و ہنر کا کبھی ارضِ یونان
روشنی جسکے کمالات کی تھی مہرِ صفت

مصر کا ایک زمانہ تھا کہ میناروں سے
اونچی رفعت میں تھی دانش وری و اہلیت

کبھی خمخانۂ عالم میں فلاطوں تھا مُغاں
کبھی بقراط۔ ارسطو کی کبھی تھی شہرت

راحِ حکمت سے کبھی شیشۂ لقماں تھا پُر
گنجِ قاروں کی کبھی روحِ رواں تھی دولت

حیف۔ یہ پھول تھے جس ملک میں وہ گلشنِ ملک
ہوگیا جور سے جلادِ خزاں کے۔ غارت

وہ بھی انسان تھے جو مر گئے پر جیتے ہیں
یہ بھی انسان ہیں۔ جیتے ہیں۔ مگر مردہ صفت

پہلے بھی ہوتا تھا پیدا نہیں ہر فردِ بشر
پہلے بھی تھی۔ یہی ترکیب۔ یہی تھی صورت

کس لئے اب نہیں اگلی سی وُہ باتیں یارب
کس لئے اب ہی زمانے کی دگرگوں حالت؟

یہ سبب ہی کہ جہالت کی گھٹائیں ایسیں
یہ سبب ہی کہ وہاں ظُلم کی چھائی ظلمت

علم کے نُور سے تھی عقل کو توقیرِ فروغ
علم کی شمع سے تھی بزم کو اُنکی زینت

ہاتھ آتی ہی انہیں روشنیٔ عظمت یاں
کُنجِ تاریک میں کرتے ہیں جو ہر دم محنت

بعد محنت کے نظر آتا ہے دولت کا نشان
پہلے پھُول آتا ہی پھر آتی ہی پھل کی نوبت

تمغۂ جاہ کے شایاں ہیں گلے ایسوں کے
آپ کر سکتے ہیں عالم میں جو اپنی عزت

یُوں تو دُنیا میں رہا ہی نہ رہے گا کوئی
جانِ شیریں کو مقرر ہے فنا کا شربت

آج تصویرِ سکندر ہے فقط آئینہ
نہ وُہ دارا کی نہ داراب کی باقی صورت

نہ تو بہمن ہے نہ کاؤس نہ کیخسرو ہے
نہ فریدوں کی نہ جمشید کی شان و شوکت

وُہ کلی کھل کے دکھاتی ہی چمن میں جوبہار
ایک دن اُسکو اُٹھانی ہی خزاں کی آفت

رُوح کو تن کے قفس میں نہیں راحت حاصل
قید پنجرے میں ہو طوطی تو اُسے کیا فرصت

زہر آلودہ ہیں سب سطحِ دُنیا کے طعام
نیک نامی ہے فقط خوان جہاں میں نعمت

آبداری میں پسینے کا وُہ قطرہ ہے شرف؟
جو کہ محنت کے صدف میں ہو گہر کی صورت

گرچہ مخلوق میں انسان ہی اک جزوِ نحیف
لیکن انسان کو ہی علم سے حاصل طاقت

نیکنامی ہی وُہ انسان کا ذاتی جوہر
نیستی پر بھی نہیں جسکو فنا کی رحمت

کیا گئی کچھ نہ گئی جاہ و حکومت جو گئی
لاکھ نعمت ہی نکونامی کی گر ہو دولت

(مطلع دوم)

جیسے یُونان کو حاصل تھی کوئی دن عزت
ہند کی بھی تھی ترقی پہ قدیمی حالت

نُورِ صنعت سے مُنوّر تھا یہاں کا عالم
عطرِ حکمت سے مُعطّر تھا دماغِ جودت

ہند وُہ ہند کہ تھا نجم و جغرافیہ یکتا
موسیقی اور عمارت میں بھی جسکی شہرت

مشتہر فنِ طبابت میں۔ ادب میں کامل
سیکھنے آتی تھی مخلوق یہاں سے حکمت

ناگہاں پھر گئی کچھ ایسی ہوا گلشن کی
اس گلِ تازہ کی جاتی رہی ساری نزہت

نہ وہ دانش ۔ نہ وہ بینش ۔ نہ رہی وہ خوبی
نہ وہ ندرت نہ وہ جدّت نہ رہی وہ طینت

جس چمن میں کہ جُھنا کرتی تھی بلبلِ گلِ تر
تنکے چُنوانے لگا بخت بہ یاس و حسرت

شورِ بختی نے نمک جہل کا ایسا چھڑکا
ہو گیا تخمِ ہنرمندی کا میٹھا شربت

پر زمانے میں یہ ہی ضرب مثل اوّل سے
پھرتی ہے کوڑی کی بھی بارہ برس میں قیمت

ہند میں ایسی حکومت نے مسیحائی کی
جس نے ہر جہل کے بیمار کو بخشی صحت

اپنی تہذیب کا اَوروں کو دکھایا رستا
اپنی اصلاح کی اَوروں کو دلائی رغبت

عدل نے ظلم کو انصاف نے بیرحمی کو
کر دیا دُور ۔ ہوئی ایسی خدا کی رحمت

بخت سوئے ہوئے ان لوگوں کے بیدار ہوئے
جن پہ تھا عرصے سے اک غلبۂ خوابِ غفلت

سینکڑوں ہیں کہ اسی مُلک کے خود حاکم ہیں
شاہ کو انکی لیاقت پہ ہے کامل شفقت

شہرۂ آفاق ہیں انجینری میں کتنے
روبرو جنکے ہے معمارِ فلک کو خجالت

کھینچیں پرکارِ خرد فکر کے تختے پہ اگر
نپ لیں رشتۂ جودت سے فلک کی وسعت

شکل بنجائے بُری جبر سے اقلیدس کی
دیکھ لے حلِّ مقالہ میں جو انکی سرعت

بعض کی طبع رسا ماہرِ کُل طبعیات
کیمیا بعض کی مشہور ہے اکسیر صفت

حار و بارد سے زمانے کے اُسے ہو گیا خوف
آب و آتش کی ہو معلوم جسے خاصیت

ہو گیا علم حصولی سے ۔ حضوری اُن کا
منطق و فلسفہ ۔ جغرافیہ ۔ ہیئت حکمت

ڈاکٹر وہ کہ جو عیسٰی کو دکھائیں آنکھیں
لرزہ آجائے ارسطو کو جو دیکھے صورت

فکر و تشخیص کا اعجاز ۔ مسیحا سے سوا
نبضِ عُشّاق سے بھی تیز ذکا کی سرعت

تار سے تارِ نفس دُور کے رشتوں سے قریب
ریل سے خلق کا ریلا ہے میانِ خلقت

الغرض ہند جسے کہتے ہیں سب اُجڑا دیار
کر دیا ہے اُسے انگریز نے رشکِ جنت

بس کر آمر طالب دل خستہ خموشی بہتر
مدح ممدوح نہیں تیری زباں کی طاقت

لکھ کر اشعارِ دعائیہ کر اب ختم کلام
ذکر اچھا ہو اجل بات کی گر دے فرصت

شاہِ خاور کی ہو مشرق میں حکومت جبتک
بادِ الطف سحر رہے رُوح کو جب تک فرحت

بختِ ایڈورڈ رہے عرصۂ عالم میں بلند
اسپِ اقبال ہو جولاں بہ لوائے نصرت

عیشِ موفور سے معمور ہو یہ سالگرہ
جلوۂ مہر سے پُرنور چراغِ صولت

عمر و دولت بڑھے ہنگام ہوں خوش کام۔ تمام
خیر کی ہوتی رہے آپ کے دم سے برکت

طالب بنارسی۔ (از بمبئی)

شمعِ ہستی

اَے شمع ہستی اَے زندگانی
بھاتی ہے دل کو تیری کہانی

ہے کُوچ تیرا ہر لمحہ جاری
جاتی ہے بگٹٹ تیری سواری

بجلی سے بڑھکر بے تاب ہو تو
یا واہمہ ہے یا خواب ہے تو

کیوں چُپ چپاتی ہر دم رواں ہو
آئی کہاں سے جاتی کہاں ہے

ظاہر ہیں یُوں تو سب پر ترے گُن
لیکن نہ پایا تیرا سر و بُن

گذرا نہ کوئی اس ہفت خواں سے
جاہل ہیں تیرے سرِ نہاں سے

فی الجملہ ہمت سب ہار بیٹھے
ہیں سر بزانو ناچار بیٹھے

اَے زندگانی اَے شمع ہستی
سونی پڑی تھی تجھ بن یہ بستی

چاروں طرف تھی چھائی اندھیری
ناگاہ اُٹھی اِک ڈیپ تیری

وُہ ڈیپ تھی بس نورٌ علیٰ نور
کا ہے کو رہتی پردہ میں مستور

پھولوں میں جھلکی تاروں میں چمکی — بخشی جہاں کو رونق ارم کی
ہوتا نہ یاں جو تیرا ٹھکانا — چوپٹ ہی رہتا یہ کارخانہ
کیا پھونک ماری دنیا کے تن میں — گویا لگا دی دون خشک بن میں
بزم جہاں میں رونق ہے تجھ سے — اس میکدہ میں ہو حق تجھ سے

ہے تیرے دم سے اے عالم آرا — بزم عروسی آفاق سارا
سرگرم ہے تو جادو گری میں — ہیں تیرے عشوہ خشکی تری میں
مٹی کا جوبن تو نے نکھارا — دے دے کے چھینٹے اسکو ابھارا
بے حس کو بخشا احساس تو نے — دی مشت گل کو بو باس تو نے
تھی بھولی بھالی بھونڈی بھنگم — تو نے سکھایا اس کو خم و چم
کرتب سے تیرے سانچی میں ڈھلکر — کندن سی نکلی رنگت بدل کر
ٹھکرا کے تو نے جب کہدیا قم — اٹھ بیٹھی فوراً کرتی تبسم
بھولی ہے اپنی اوقات پہلی — پھرتی ہے خوش خوش کیا البیلی

پاتی ہے خلقت جب تیری آہٹ — ہوتی ہے پیدا اک گدگداہٹ
مچتا ہے پھر تو اودھم غضب کا — بجتا ہے ڈنکا عیش و طرب کا
کہتی ہے دنیا تو ہے تو کیا غم — تو آئے نت نت تو آئے جم جم
جیتے ہیں جب تک مرتے ہیں تجھ پر — سب کچھ تصدق کرتے ہیں تجھ پر
کیا مال ہے جو تیرے سوا ہے — تو ہی نہ ہو تو سب پر دھتا ہے

اے سب کی پیاری سب کی جیتی — کہ منہ زبانی کچھ آپ بیتی
"قدرت کے گھر کی میں لاڈلی ہوں — ناز و نعم سے برسوں پلی ہوں
تقویم حسن میرا لگن تھا — فردوس اعلیٰ میرا وطن تھا
حور و ملک کی آبادیاں تھیں — بیفکریاں تھیں آزادیاں تھیں

چلتی تھی ہر دم بادِ بہاری — شیر و عسل کی نہریں تھیں جاری
میری ادا پر مرتے تھے قدسی — سجدہ پہ سجدہ کرتے قدسی
تکریم میری ہوتی تھی از حد — ہیں داستانیں جسکی زباں زد
پھر دیس چھوڑا گذری سو جھیلی — پردیسیوں کا اللہ بیلی
پل مارتے کا ہے یہاں بسیرا — حبِ وطن ہے ایمان میرا

آب و ہوا میں دشت و جبل میں — میری رسائی ہے ہر محل میں
لیکن یہاں میں خلوت نشیں ہوں — ہوں اس طرح پر گویا نہیں ہوں
خوابِ گراں کی حالت ہے طاری — مستی میں گم ہے سب ہوشیاری
جب آتے آتے سبزہ میں آئی — کروٹ بدل کر میں لہلہائی
انگڑائیاں لیں منہ کھول ڈالا — پر آنکھ سے کچھ دیکھا نہ بھالا
داخل ہوئی جب حیواں کی تن میں — اک شور اٹھا اس انجمن میں
انساں کا جامہ جب میں نے پہنا — اللہ رے میں کیا میرا کہنا
کس کس جتن سے میں نے بنایا — رتبہ بہ رتبہ پایہ بہ پایہ
جامد کو نامی نامی کو حیواں — حیواں کو وحشی وحشی کو انساں
پھیلایا میں نے کیا کیا بکھیڑا — شادی و غم کے ارگن کو چھیڑا
نیکی بدی کے میلے جمائے — جھوٹ اور سچ کے سکے چلائے
جو ناچ میں نے جسکو نچایا — وہ ناچتے ہی اس کو بن آیا
القصہ ہوں میں وہ اسمِ اعظم — ہے جسکے بس میں تسخیرِ عالم
کچھ کچھ کھلے ہیں انداز میرے — دیکھے ہیں کس نے اعجاز میرے
مجھ کو نہ سمجھو تم آج کل کی — ہوں موجِ مضطر بحرِ ازل کی
رکھوں گی جاری یوں ہی سفر میں — قعرِ ابد کی لوں گی خبر میں

ہے میری ہستی اک طرفہ مضموں کچھ بھی نہیں ہوں پر میں ہی میں ہوں
سُنئے تو ہوگے میری کہانی
جب تک ہے باقی دنیا فانی

محمد اسمٰعیل میرٹھی

اُمّید

تو ہے وُہ تیز جوت اَے اُمید ماند ہے تیرے سامنے خورشید
شب کو نیر میں آب و تاب کہاں ہے چمک تیری رات دن یکساں
تو نے سارے جہان کو گھیرا آسرا ہر بشر کو ہے تیرا
تیرے آگے ہیں مشکلیں سب ہیچ خود بخود کھُل گئے ہیں مشکل پیچ
یہ بھی عُقدہ کھُلا کہ کوہِ غم تیرے پرتو میں قطرۂ شبنم
زندگانی کی تو ہے باغ و بہار ہیں دلاویز تیرے برگ و بار
جسکے دل میں جما ترا پودا اُس نے حسب المراد پھل پایا
تیرے سایہ کو دیکھکر اَے آس یاس کی دھوپ تک نہ آئی پاس
اخترِ بخت کی چمک ہے تو تاج اور تخت کی جھلک ہے تو
تھے زمانہ میں جو بڑے فتّاح تھے وُہ تیرے ہی بس فقط مداح
نزدِ اربابِ عقل و فہم و تمیز تیری ہوتی ہے مال و زر نا چیز
اگئی ہے قریب شکل بعید قدرتی دُور بیں ہے تو اُمّید

کامیابی کی تو ہے جڑ بے شک — جسکو شک ہو وہ رفع کرے شک

عرض کرتے ہیں یہاں مثالاً ہم — داستانِ سکندرِ اعظم

کی چڑھائی جب اُس نے ایران پر — تاکہ دارا سے چھین لے کشور

ہوگیا جمع لشکرِ جرّار — کُوچ کرنے کو جبکہ تھا تیّار

اِس خوشی میں بکھیر کی اُس نے — یہ سخاوت کی داد دی اُس نے

ایک سردار نکتہ چیں نے کہا — اَے جہاں بخش خسروِ دانا

یُوں لٹا دی دھڑی دھڑی دولت — جیسے پالی گری پڑی دولت

یہ بھی تو سوچ اَے شہِ والا — اس مہم کے لئے بھی کچھ رکھا

اُس نے فرمایا ہاں میری اُمّید — حق میں میرے ہے ایزدی تائید

پھر مجھے کیا کمی ہے اَے سردار — مَیں ہُوں زرپاش و زرفشاں زردار

سُنکے دندان شکن جواب سوال — دیا پھیر اُس نے جو ملا تھا مال

اور کہا یہ کہ اَے ولی نعمت — میرے کس کام کی ہے یہ دولت

لاد کر کون لیچلے توڑے — جس سے تھک جائیں اونٹ اور گھوڑے

قول ہے آپ کا نہایت ٹھیک — ساری دُنیا جہان کے نزدیک

ہے یہ اُمّید ہی بڑی دولت — چاہتا ہُوں اسی میں میں شرکت

کیجئے منظور میری شرکت کو — دیجئے اِس لازوال دولت کو

ہم سخن اُس کے سب امیر ہُوئے — سب اسی لیکھ پر فقیر ہُوئے

جو ہے تجھ پر مِٹا ہوا اَے آس — کہدو سب کچھ ہے اس فقیر کے پاس

مختصر بات یہ ہے اَے اُمید — تو ہے جاہ و جلال کی تمہید

بہرِ اُمّید وار اسکندر — تھی یہ تمہید ہی نشانِ ظفر

ملکِ یُوناں سے تا بہندوستاں — کُل ممالک تھے تابعِ فرماں

اُس کی تلوار سے گئے سب کانپ — آگ سے جیسے خوف کھائے سانپ
جو مقابل ہُوئے ہُوئے نابُود — مر گئے جنکی فاتحہ نہ دُرود
اپنا سکّہ بٹھا یا دُنیا پر — آفریں بر فتوح اسکندر
بختمندی کی جتنی شہرت ہے — سب یہ اُمید کی بدولت ہے
کامیابی میں شہرۂ آفاق
ہو گا بے شک امید کا مشتاق

بہاری لعل مشتاق دہلوی

دُنیا کی اُجڑی ہُوئی محفل

شب کہ تھا میں نقشبندِ عالمِ نیرنگِ خواب — تھی بہم سرگرمِ صحبت چند یارانِ شباب
اِک طرف آراستہ چھوٹی سی تھی اِک بزمِ عیش — کھل رہا تھا اِک طرف پھُولوں کا تختہ لاجواب
اِک طرف چھٹکی ہُوئی تھی صاف ستھری چاندنی — بہ رہی تھی اِک طرف اٹکھیلیوں سی جُوئے آب
اِک طرف تھے میز پر پھُولوں کے گلدستے دھرے — اِک طرف گملوں میں تھا پھُولا ہُوا دیسی گلاب
اِک طرف شاخوں پہ سرگرمِ ترنم تھے طیور — اِک طرف تھا اہتمامِ نغمۂ چنگ و رباب
خندۂ گل اِک طرف گلبانگ بلبل اِک طرف — اِک طرف محفل میں ترتیبِ مے و نقل و کباب
جھُومتے تھے اِک روش پر نونہالانِ چمن — اِک کنارے سبزۂ بیگانہ تھا سرمستِ خواب
بھینی بھینی چل رہی تھی جانفزائی سے نسیم — عنبر افشاں ہر خیاباں میں تھی بُوئے عطرِ ناب
کس تکلف سے تھی شبنم صرف تزئینِ چمن — دیکھ چھینٹے مُنہ پہ پھولوں کے چھڑکتی تھی گلاب

سُرمہ آگیں تھی اِدھر نرگس کی چشمِ سحر ساز
جعدِ مشکیں کو اُدھر دیتا تھا سنبل پیچ و تاب

جو شجر تھا فی المثل تھا انتخابِ روزگار
پھُول جو تھا اپنے اپنے رنگ میں تھا لاجواب

دیکھ کر محفل میں پروانوں کو سرگرمِ وصال
شمع کہتی تھی پڑی ہو رات۔ کیا ہی اضطراب

الغرض جملہ مہیا تھے وہاں اسبابِ عیش
ساقی و جام و سبو و مطرب و چنگ و رباب

سامنے جُھرمٹ پریزادوں کا تھا سرگرمِ ناز
جوش پر آیا ہوا ایک ایک کا کافرِ شباب

سب کے سب آفت کے پرکالے تھے سر سے پاؤں تک
سب کے سب تھے عشوہ و ناز و ادا میں انتخاب

جوشِ گل تھا۔ انجمن تھی۔ غنچہ احباب تھا
چاندنی تھی رات اور گردش میں تھا جامِ شراب

دیکھ کر یہ عالمِ نیرنگ و سامانِ نشاط
چاہتا تھا شوق ہو محفل میں بڑھ کر باریاب

اور لُوٹے اُن پریزادوں سے ہو کر ہمکنار
کھول کر دل بے تکلف دولتِ حُسنِ شباب

آگئی عقلِ نصیحت سنج اتنے میں وہاں
لیکے چٹکی مُسکرا کر یُوں کیا مجھ سے خطاب

ہوش میں آ۔ او شرابِ عشق کے ماتے ہوئے
ہو ہوائے شوق میں اتنا نہ گرمِ اضطراب

اِک مرقع ہے یہ نیرنگِ فسونِ دہر کا
جسکو تو سمجھے ہوئے ہے بزمِ یارانِ شباب

یُوں تو منظر ہے بظاہر اُسکا اِک اِک دلفریب
یُوں تو اپنے رنگ میں یہ انجمن ہے لاجواب

یُوں تو ہے معمورۂ عیش و طرب یہ بزمِ ناز
یوں تو اِک اِک سیمبری ہے آہ اُسکی انتخاب

یہ تماشا گاہ لیکن سیر کے قابل نہیں
اِس مرقع کی ہر اک تصویر ہے تمثالِ خواب

ہے وُہ حیرت خانۂ نیرنگ یہ صورت کدہ
ہے بھرا ہر پیکر گویا میں رنگِ انقلاب

سامنے جُھرمٹ جو یہ پریوں کا ہے سرمستِ ناز
کھینچتی ہے دل کو جنکی شوخیٔ حُسنِ شباب

صورتیں دُنیا کی ہیں گرویدگی کی سب یہ آہ
مجھ سے سُن لے تو حقیقت انکی او خانہ خراب

نفس کافرکیش کے ہے ہاتھ میں انکی عناں
کجروی میں اپنا رکھتا ہے جو مشکل سے جواب

پیاری پیاری ہے اگرچہ انکی صُورت موہنی
دیکھنے میں گو بظاہر انکا دلکش ہے شباب

اِن شبیہوں سے دلآویزی ٹپکتی ہے۔ مگر
بے حقیقت ہیں برنگِ پیکرِ تصویرِ خواب

اک طلسمِ دلفریب ہستیٔ موہوم ہے
انکی شوخی - انکی تمکیں - انکا حسن - انکا شباب

انکی فطرت میں نہیں ہے پاسِ ناموسِ وفا
شیوۂ عاشق کُشی ہے انکی ملت میں ثواب

دین و دنیا سے گیا جو اُن پہ گرویدہ ہوا
پھر نہیں رہتا کہیں کا آہ وہ خانہ خراب

آگیا جو حیف ان سیمیں تنوں کے دام میں
ہاتھ سے بس اُس نے کھودی دولتِ عہدِ شباب

نوش دیکر اوّل اوّل عاشقِ جانباز کو
چاشنی انکی چکھا دیتی ہے آخر زہرِ ناب

تو اگر فرزانہ ہے تو اِن سے رہنا ہوشیار
رہزنِ دنیا و دیں ہیں آہ یہ خانہ خراب

دُور رہنا دیکھ ان اصنام کافر کیش سے
ہیں یہ پریاں خانہ سوزِ طاعت و زہد و ثواب

کر چکی جب یُوں نصیحت گستری عقلِ سلیم
مجھ سے بولی پھر اشارہ کرکے او خانہ خراب

سامنے یہ جو دھری ہیں شیشہ و جام و سبو
جنکے دلدادہ نظر آتے ہیں یارانِ شباب

نشۂ دنیائے دُوں سے سب کے سب معمور ہیں
زہر ہے انمیں بباطن - اور بظاہر ہے شراب

یہ وُہ مے ہے جسکی مستی ہے پیامِ خوابِ مرگ
نشۂ غفلت ہے جس میں ہے یہ وُہ صہبائے ناب

پھر کہا مجھ سے کہ او محوِ نشاطِ زندگی
سوجھتا اتنا نہیں تجھ کو ارے خانہ خراب

ہے وُہ غافل کوسِ رحلت کی صدائے دردناک
جسکو تو سمجھے ہوئے ہے نغمۂ چنگ و رباب

آرہی ہے ہر طرف سے بانگِ آوازِ جرس
کارواں منزل بہ منزل جارہے ہیں سب شتاب

خوابگاہِ عیشِ دنیا - نیند کے ماتے! نہیں
تو سمجھ کر منزلِ ہستی میں ہو سرگرمِ خواب

تیری منزل ہو کہیں کھوٹی نہ غافل نیند میں
پھٹ چلی پَو اور نکلنا چاہتا ہے آفتاب

خوابِ غفلت میں نہ کھو سرمایۂ عمرِ عزیز
کام کر کچھ - مغتنم ہے فرصتِ عہدِ شباب

بجگیا پیری میں جب نقارہ کوسِ رحیل
پھر نہ پچھتائے سے ہاتھ آئیگا کچھ خانہ خراب

کہ کے اتنا ہو گئی رخصت اُدھر عقلِ رسا
اور اُدھر محفل پہ چھایا آہ ایسا انقلاب

اُڑ گیا پریوں کا جُھرمٹ یک بیک صف باندھ کر
صبحدم آنکھوں سے اُڑجاتا ہے جیسے رنگِ خواب

آفتِ جاں جنکی تھی اک اک ادائے دلفریب
ہوگئیں وُہ پیاری پیاری صورتِ تمثالِ خواب

تھے مے گلرنگ سے لبریز جو شیشے ابھی
اب جو دیکھا انکو تو اُن میں بھرا تھا خونِ ناب

چھا رہی تھی یوں اُداسی بزم پر اب سر بسر
ڈھلکے رہجاتی کیبکا جس طرح حُسنِ شباب

لوٹتے تھے آگ پر کچھ پارۂ لختِ جگر
سوندھی سوندھی انجمن میں اب نہ تھی بُوئے کباب

خاک اُڑاتی تھی وہاں ہر سو سمومِ جانگزا
بہ رہی تھی جس جگہ اٹکھیلیوں سے جُوئے آب

اب نہ تھی وہ تابشِ انوارِ حُسنِ دلفروز
لیلیا تھا جھلملا کر شمع نے رُخ پر نقاب

ایک جانب تھی پڑی محفل میں پروانوں کی خاک
تھرتھراتے تھے نہ اب فانوس پر خانہ خراب

اب نہ تھی وہ ہلکی ہلکی چاندنی نکھری ہُوئی
اب نہ تھا پیشِ نظر پھُولوں کا تختہ لاجواب

اب نہ تھے شاخوں پہ مُرغانِ چمن نغمہ سرا
اب نہ آتی تھی صدائے نغمہ چنگ و رباب

اب نہ تھی وُہ گرمیِ ہنگامۂ عیش و طرب
خاک پر یارانِ محفل اِک طرف تھے محوِ خواب

دیکھ کر یہ رنگ ششدر دل میں تھا میں ناگہاں
سامنے آئی نظر محفل میں اک تمثالِ خواب

قد میں تھی فتنہ گری۔ آنکھوں میں سفاکی بھری
قہر آلودہ نگاہوں سے ٹپکتا تھا عتاب

دوش پر نیزہ۔ کمر میں دشنۂ خونریز تھا
سر پہ تھا خُونِ دو عالم۔ ہاتھ میں تیغِ خوش آب

گوشۂ دامن لہو میں تھا اُدھر ڈوبا ہُوا
خُون کے چھینٹوں سے گلگوں تھا اُدھر طرفِ نقاب

تھی وُہ کافر ترش تیغِ نگاہِ خشمگیں
خونبہا جس کا نہ مانگے سے ملے روزِ حساب

بیمروت۔ بیوفا۔ غارتگرِ خلقِ خُدا
فتنہ ساماں۔ آفتِ جاں۔ یارکُش خانہ خراب

سرعتِ سیماب رگ رگ میں بھری تھی جائے خُوں
برق تھی یا تھی چھلاوہ شوخیِ حُسنِ شباب

کچھ عجب بانکی ادا سے شوخیاں کرتی ہُوئی
آئی اُس اُجڑی ہُوئی محفل میں ظالم بیحجاب

پھر وہاں پہنچی یکایک تیغ چمکاتی ہُوئی
لمبی تانے جس جگہ سوتے تھے یارانِ شباب

کر کے اِک اِک کو قتیلِ دشنۂ خونچکاں
خاک کا گنبد بنا کر پھر دیا اُن سب کو داب

چھا گیا آنکھوں میں سب کے خوابِ نوشینِ اجل
بنگئی شہرِ خموشاں اب وُہ بزمِ لاجواب

یادگارِ رونقِ محفل نہ تھی اب کوئی چیز
سامنے آنکھوں کے تھی تصویرِ رنگِ انقلاب

دستِ گلبن جس جگہ خمیازہ کش تھے ناز سے   چھوٹتے تھے اُس جگہ فوّارہ ہائے خونِ ناب
حسرت آگیں اک مرقعِ غم کا تھا پیشِ نظر   ہو رہی تھی کچھ عجب بدرنگ اب تمثالِ خواب
دیکھ کر یہ رنگ آنکھوں سے رواں تھی جوئے خوں   دِل سے آتی تھی صدا تھم تھم کے او خانہ خراب
یہ نتیجہ آہ ہو جس عیش کا پایانِ کار   تُف ہے ایسے عیش پر۔ اُس سے تو بہتر ہی عذاب
حظِّ دُنیا کی بہت گرویدگی اچھی نہیں   نوش کے قابل نہیں اے بوالہوس یہ شہدِ ناب

دِل لگانے کی جگہ دُنیا نہیں ہے اے سرور
ساتھ دیتی ہے کسی کا آہ کب خانہ خراب

سرور جہان آبادی

شام

طاؤسِ شام نے جو دیے کھول بال و پر   چمکے ستارے صورتِ گلہائے نقشِ زر
گردوں کے سمت اپنی جہاں تک گئی نظر   دیکھا کہ ایک فرشِ مرصّع ہے سر بسر
آئی ندائے غیب کہ یہ وقتِ شام ہے
آمد ہے شب کی چار طرف دن تمام ہے

جب آفتاب کا نہ رہا چرخ پر قیام   بکھرائے بال آئی عدم سے عروسِ شام
زیور ستاروں کے نظر آنے لگے تمام   پیرِ فلک نے باندھی کمر بہرِ انتظام
مہتاب ہاتھ باندھ کے آیا سلام کو
حیرت سی ایک ہو گئی ہر خاص و عام کو

غنچے چمن میں کھل گئے۔ ٹھنڈی ہوا چلی   سبزے میں جان آ گئی ہنس ہنس پڑی کلی

بُلبل کے دل میں ہو گئی پھر ایک بیکلی   پھُولوں کی بُو سے بس گئی ہر شہر کی گلی
اِک پھُول سے سبھوں کا معطّر دماغ ہے
ظاہر میں ایک پھول ہے لیکن یہ باغ ہے

ہر شاخ کے ہیں پھُولوں سے دامن بھرے ہُوئے   پانی سے دیکھو پتّے چمن کے ہرے ہُوئے
غنچوں کی نازکی سے ہیں گلچیں ڈرے ہُوئے   تازہ ہُوئے جو لو سے شجر تھے مرے ہُوئے
پتّے زمرّدیں جو چمن میں شجر کے ہیں
شبنم کے قطرے قطرے میں نقشے گہر کے ہیں

ٹھنڈی ہوا کا جوش میں چلنا وہ بار بار   ہلنا وُہ پتّیوں کا درختوں کی وُہ قطار
پھر جا بجا گلاب کے پھُولوں کی وُہ بہار   سیرابیاں وُہ باغ کی سنبل کا وُہ نکھار
کیا وصف ہو بیان ترے انتظام کا
قابل درود پڑھنے کے عالم ہے شام کا

تھی دن کی دھوپ میں جو تمازت نہیں رہی   گرمی کے مارے تھی وُہ جو وحشت نہیں رہی
لُو سے جو اپنی غیر تھی حالت نہیں رہی   خسخانہ اور برف کی حاجت نہیں رہی
بارش نہ ہو جو اب کے برس کوئی غم نہیں
شبنم کے قطرے دانۂ گوہر سے کم نہیں

طائر ہوا میں کھولے ہُوئے اُڑ رہے ہیں پر   بلبل چہک رہی ہے چمن میں ادھر اُدھر
ہے فکر آشیانہ میں ہر ایک جانور   بیٹھے ہیں بعض اُونچے درختوں کی شاخ پر
چوپاؤں کے بھی رہنے کا اِک انتظام ہے
کچھ دن کو اس سرا میں ہر اک کا قیام ہے

جلنے لگے چراغ موذّن نے دی اذاں   ہونے لگیں کلیسوں میں اب بُت پرستیاں
پاؤ گے رہروؤں کو سرا کے سوا کہاں   دیکھو گے قافلے کو وہاں ہے جہاں کنواں

ہاں بعض راہگیر ہیں پیچھے مقام سے
جنگل کے کُنج میں ہیں چھپے خوفِ شام سے

ہے آسمان جو تیرہ تو میدان میں دُھواں   جنگل کی جھاڑیوں سے ہے سناٹا اک عیاں
اُس میں پہاڑ ایسے مخوّف کہ الاماں   پھر اُن کے آس پاس یہ لبریز ندیاں
دیکھو وہ شیر چھوڑ کے نکلے ہیں غار کو
بیجان کی طرح ہے خموشی شکار کو

سنسان وُہ جگہ وُہ اُداسی کا دخلِ عام   وُہ بادِ نرم اور وُہ اِک شمعِ وقتِ شام
وُہ کچھ درخت نیم کے تاریک وُہ مقام   وُہ ٹوٹی قبریں اور وُہ کچھ لوح ناتمام
نقشہ یہ وُہ ہے دل سے جو اب تک مٹا نہیں
افسوس ساکنانِ عدم کا پتا نہیں

ہاں اہلِ بزم محفلیں آراستہ ہوئیں   ہے آج رشکِ گنبدِ گردوں یہ سرزمیں
بلّور کے ہیں جھاڑ بھی روشن کہیں کہیں   زینت مکاں کی ہوتی ہے ہوتے ہیں جب مکیں
اے عرشؔ آؤ زندہ دلی سے بھی کام لو
تم کس کو رو رہے ہو ذرا دل کو تھام لو

مولوی ضمیر الدّین احمد عرشؔ

دربار نمبر

جو دسمبر سنہ ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اِس کے مضامین بجائے ۵۶ کے ۹۶ صفحہ پر آئے تھے۔ اور انہیں بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا تھا۔ اس کی کچھ زاید کاپیاں رکھی ہیں۔ جن حضرات کو شوق ہو جلد طلب فرمائیں۔ اِس میں کئی نظمیں مستقل قدر کے قابل ہیں۔ قیمت ۶/ بذریعہ ترسیل ٹکٹ ہائے ڈاک یا وی پی طلب کیجئے+ مینیجر مخزن

انگریزی لباس

ہمارے مکرم جناب مولوی محمد یوسف صاحب جعفری رنجور عظیم آبادی کلکتہ سے یہ ایک دلچسپ نظم ارسال فرماتے ہیں۔ مولوی صاحب کا نام اخباری دنیا میں کوئی نیا نام نہیں ہے۔ آپ علیگڈھ کالج کے قدیم طلبا میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ایک مدت تک پٹنہ انسٹیٹوٹ گزٹ کے (جو اردو و انگریزی میں نکلتا تھا) ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ انشا پردازی میں آپ کا پایہ بہت بلند ہے۔ آپکے مضامین اخبارات میں اکثر شائع ہوتے ہیں۔ اور آجکل آپ کلکتہ بورڈ آف ایگزامینرس کے چیف مولوی ہیں :-

ہیں جو میرے برادرِ امجد ✝ شفقت جن کی مجھ پہ ہے بیحد
اُن سے اک روز عرض میں نے کی گر کریں عفو میری گستاخی
تو کروں عرض آپ سے اِک بات جس سے تشویش ہے مجھے دن رات
بولے - وہ بات کیا ہے؟ شوق سے کہہ اُس کے کہنے سے تو نہ قاصر رہ

تب یہ مَیں نے کہا - کہ حضرتِ من! میرے دِل کو اسی کی ہے اُلجھن
یہ روش کیوں جناب کو بھائی ترک کر دی جو وضعِ آبائی؟
نہ وہ پاجامہ ہے نہ ہے اچکن بلکہ ہے کوٹ پینٹ زیبِ بدن
ہے بجائے عمامہ سر پر ٹوپ ہو گئے آپ مولوی سے پوپ ٭
گرچہ رکھتے ہیں چہرے پر ڈاڑھی پر لبیں ہیں ضرور حد سے بڑھی
آپ نے جو یہ ترکِ وضع کیا خوبیاں اس میں - کہئے ہیں کیا کیا؟

✝ حضرت اخی المعظم شمس العلما مولانا سید امجد علی صاحب ایم - اے - پروفیسر میور سنٹرل کالج الہ آباد (رنجور)
٭ رومن کیتھولک عیسائیوں کا مذہبی سردار جو روم (اٹلی) میں رہتا ہے (رنجور)

اور نقصان کی جو پوچھیں جناب — تو نہیں اس کا کچھ شمار و حساب
پھر بھی دو چار عرض کرتا ہوں — عرض کرنے میں گرچہ ڈرتا ہوں
دیکھتے ہیں جو صورتِ ظاہر — لوگ کہتے ہیں آپ کو کافر
آپ کی شکل دیکھکر حضرت! — ہوتی ہے انکو وحشت و نفرت
خیر اُن کی اگر نہیں پروا — سوچیئے یہ تو اپنے دل میں ذرا
جب کہ یوں شکلِ ظاہری بدلی — حالت باطنی بھی بدلے گی
ہوگی خویش و بیگانہ سے نفرت — صاحبوں کی خوش آئیگی صحبت
پر وہ حاکم ہیں آپ ہیں محکوم — وہ ملیں آپ سے یہ ہے معلوم
الغرض - اپنی قوم بھی چھوٹی — صاحبوں سے اُمید بھی ٹوٹی

میری تقریر سن چکے جس دم — بولے ہنسکر برادرِ اعظم
تو نے جو کچھ کہا وہ سچ ہے - مگر — غور اب میری بات پر بھی کر
لوگ کافر کہیں تو کیا ڈر ہے؟ — عالم الغیب ربّ اکبر ہے
جانتا ہے وہ دل کی سب باتیں — اُس پہ ظاہر ہیں نفس کی گھاتیں
کفر و ایماں تو دل پہ ہیں موقوف — جانتے اِس کو ہیں سب اہلِ وقوف
گو رکھیں لوگ ہم سے دل میں بیچ — کارِ ما با خداست - دیگر ہیچ

شکلِ ظاہر کا اِعتبار نہ کر — دل حسینوں کے ہوتے ہیں پتھر
جب بھرا دل میں ہو فریب و دغا — جُبّہ و خرقہ بھی جو پہنے تو کیا؟
مولوی ایسے کتنے پائے گا تُو — جن میں ایمان کی نہیں کچھ بُو
وہ پہنتے ہیں جُبّہ و دستار — تاکہ اِس آڑ میں وہ کھیلیں شکار
خود کو پجواتے ہیں مُریدوں سے — اور اُنہیں لوٹتے ہیں جی بھر کے
دین کا پردہ آگے ڈالتے ہیں — پھر دلی حسرتیں نکالتے ہیں

برملا کرتے ہیں وہ ایسے کام — جن سے شرمائے فاسقِ بدنام

ماسوا اِسکے۔ یوسفِ خوشخو! — ہندیوں کے لباس ہیں جو جو

وُہ کہاں ہیں لباسِ اہلِ عرب؟ — اُنکو اسلام سے علاقہ ہے کب؟

پھر برابر ہوئے لباس سبھی — یورپی ہوں وُہ۔ یا کہ ہوں ہندی

بلکہ مَیں کہدوں تجھ سے صاف صریح — ہے لباسِ فرنگ کو ترجیح

زیبِ تن اِسکو کرتے ہیں اَتراک + — جنکی تہذیب کی بندھی ہے دھاک

تونے جو کچھ سُنے یہ میرے مقال — تھے یہ سب صرف بہرِ استدلال

میرا مطلب اسی قدر ہے فقط — ہے لباسوں پہ اعتراض غلط

جن کو جن کپڑوں کی ضرورت ہو — شوق سے وُہ انہیں پہننے دو

نہیں اسلام میں لباس کی قید — چاہیے دل میں ہو نہ مکر و شید

باطن انسان کا درست رہے — چاہے پھر جو لباس وُہ پہنے

ہے مسلماں کو صرف یہ لازم — رہے پابندِ شرع وُہ دائم

جو اوامر ہیں وُہ بجا لائے — جو نواہی ہیں اُن سے باز آئے

اتنی تقریر ہونے پائی تھی — کہ یہ آواز غیب سے آئی

در خصوصیتِ لباس مکوش — قولِ سعدی شنو ز گوشِ ہوش

در عمل کوش و ہرچہ خواہی پوش — تاج بر سر نہ و عَلَم بر دوش

محمد یوسف جعفری

+ جمع تُرک (رنجور)

میرا نام کیا ہے؟

بتلاؤ عقل والو! ہاں میرا نام کیا ہے؟ — مَیں کیا ہُوں اور تماشا یہ صبح و شام کیا ہے؟
شرقی جھروکے سے ہُوں دکھلاتا اپنا درشن — دِکھلا کے اپنا درشن کرتا ہُوں دُن کو روشن
آکر مَیں جھانکتا ہُوں کھڑکی پہ جب تمہاری — چمکیلی آنکھ سونا ہوتا ہے دیکھ واری
کہتا ہُوں تم سے آکر "ہے وقت جاگنے کا" — سُستی سے کاہلی سے کوسوں ہی بھاگنے کا
کچھ اس لئے نہیں ہے روشن یہ میرا ہونا — یُوں کب تلک بچھونے پر اینڈ اینڈ سونا؟
چمکا ہُوں اِس لئے مَیں تا اُٹھ کے سب کرو کام — لکھو پڑھو کرو سب روشن جہان میں نام"
مجھ سے نہیں جہاں میں سیلانی کوئی بڑھ کر — پھرتا ہوں سیر کرتا مَیں سارے آسمان پر
ہرگز نہیں ٹھہرتا اصلا نہیں میں تھکتا — میداں میں بے تکاں ہُوں دن رات دوڑ سکتا

چمکیلی کرنوں کا ہی اک تاج میرے سر پر — جس کی کہ جگمگاہٹ پھیلی ہے بحر و بر پر
ہُوں آن کر چمکتا پیڑوں پہ اور گھروں پر — دریا کی مچھلیوں پر مرغابی کے پروں پر
ہر شے کہ جس پہ میری ہے روشنی چمکتی — ہے نُور سے چمکتی ہے حُسن سے دمکتی
پکتے ہیں مجھ سے میوے۔ پکتی ہے مجھ سے کھیتی — دیتا ہُوں مَیں ہی تم کو گرمی بھی روشنی بھی
اُونچا درخت سی ہُوں۔ اُونچا ہُوں میں گھٹا سے — اُونچا ہُوں آسماں پر مَیں قدرتِ خدا سے
گر مَیں کبھی تمہارے تھوڑا بھی پاس آتا — جاتے جُھلس جُھلس تم۔ مَیں تم پہ موت لاتا
رہتی نہ گھاس بھی یُوں صحرا میں لہلہاتی — جل کر سیاہ ہوتی۔ اُڑ مثلِ خاک جاتی
چمکیلی کرنوں کا ہُوں جب تاج اُتار لیتا — صافہ ہُوں بدلیوں کا سر پر سنوار لیتا
اُسوقت میری جانب ہاں دیکھ سکتی ہو تم۔ — لیکن ہو بدلیوں کا نام و نشان جب گم
اور مَیں چمک رہا ہُوں تیزی سے دوپہر کو — بھر کر نظر جو دیکھے طاقت کہاں نظر کو؟

دیکھے تو ہے چکاچوندھ آنکھوں کو آ گی لگتی
ایسی کہ دیکھتے ہی ہو جائیں دونوں اندھی

ہاں اک عقاب مجھ کو اُس دم ہے دیکھ سکتا
تیز اور قوی نظر سے پیہم ہے دیکھ سکتا

ہونے کو جب کہ ظاہر ہوتا ہوں میں سحر کو
تا کہ دکھاؤں ہیں دن اُسوقت با اثر کو

اُڑتا لوا ہے مجھ سے ملنے کو آسماں تک
اُڑکر ہوا پہ کیا کیا گاتا ہے راگ دیپک

مُرغا بھی چیخ کر ہے کیا کیا اذان دیتا
پیغام سب کو میرے آنے کا آن دیتا

چمگادڑ اور اُلو لیکن ہیں بھاگ جاتے
جس وقت دیکھتے ہیں تیری سحر مجھ کو آتے

مُنہ اپنا ہیں پرانی دیواروں میں چھپاتے
یا کھول میں پرانے پیڑوں کے جا سماتے

کھوؤں میں آکھروں میں شیر اور بھیڑئیے بھی
رہتے چھپے ہیں دن بھر لیتے ہیں نیند گہری

دیکھو تو میں چمکتا یاں ہر مقام میں ہوں
گر ہند سندھ میں ہوں گہ روم و شام میں ہوں

انگلینڈ میں کبھی ہوں - امریکا میں کبھی ہوں
روئے زمیں پہ ہر جا پھیلاتا روشنی ہوں

پیدا نہیں ہے کوئی روئے زمیں پہ جانتا
مجھ سا جمال والا مجھ سا جلال والا

میں کیا ہوں اور تماشا یہ صبح و شام کیا ہے؟
بتلاؤ عقل والو! ہاں میرا نام کیا ہے؟

(ماخوذ از انگریزی)

عروس

تازہ غزلیں

تب بنا حال ہے ہر شب تری آزاری کا
کچھ ٹھکانا ہے اس اُلجھی ہوئی بیماری کا

بعد کوشانہ کی جانب سے ہوئی ہے تحریک
سلسلہ پہلے بندھا اپنی گرفتاری کا

سادگی چاہیے اشکوں میں کہ پیری کے ہیں دن
اب زمانہ نہ رہا چشم کی خونباری کا

گر پڑی مے یہ بھرا جام لبالب ہم نے
کس سے احوال کہیں اپنی گنہگاری کا

اے مسیحا اثر انگیز ہے دل کا احوال
تو بھی سُن لے کہ فسانہ ہے اک آزاری کا

باتیں دُنیا کی مناسب نہیں میخانے میں
ذکر اس پاک جگہ کیا زنِ بازاری کا

خُوب دل کھول کے پیتا ہوں کہ ساقی ہے خموش
ایک دن حال کہیگا مری سرشاری کا

بند آنکھیں رہیں تا عُمر ترے کوچہ میں
حال کھلنے نہ دیا دل کی طلبگاری کا

شادؔ نیت میں صداقت نہ ہو جس وقت تلک
نام بیفائدہ کیوں لے کوئی دینداری کا

یہاں تک عشق نے دِل کو نچوڑا پنجۂ غم سے
ٹپکتا ہے لہو ہر وقت اپنی چشمِ پُرنم سے

نہ کر صیاد اتنا ظلم طاقت ہے کہاں غم سے
قفس کو لے کے کیا اُڑ جائینگے بے بال و پر ہم سے

نہ کرنا قصد ہمدم زخمِ دل کی چارہ سازی کا
محبّت میں ہماری داغ لگ جائیگا مرہم سے

سحر ہے شمع اب بُجھتی ہے تارے جھلملاتے ہیں
وہ جاتے ہیں یہاں آنسو رواں ہیں چشمِ پُرنم سے

خُدا رکھے تمہاری چاند سی صورت کا کیا کہنا
بلائیں حُسن بھی لیتا ہے پیہم زلفِ پُرخم سے

نہ بہلا مجھ کو بس اے چارہ گر تو آپ ناداں ہے
جگر کا زخم بھی اچھّا کہیں ہوتا ہے مرہم سے

یہ کیسی زندگی ہے روز جیتا اور مرتا ہوں
کسی کے وصل کی اُمّید سے اور ہجر کے غم سے

اِسے دیکھے سے اپنی سینہ چاکی یاد آتی ہے
چھپا لے آہ ردائے شب گریبانِ سحر ہم سے

ہوائے گرم سے چرخ آگ برساتا ہے یہ ضد ہے
مری تربت کا سبزہ جب ہرا ہوتا ہے شبنم سے

شبِ مہتاب کا عالم نظر آتا ہے آنکھوں کو
لحد میں چاندنی چھٹکی ہے داغِ حسرت و غم سے

ہُوئے واں زینت افزائے بساطِ عیش دشمن گو
گلے مِل مِل کے یاں روئی تمنّا رات بھر ہم سے

اگر ہے دید کا طالب نگاہِ شوق پیدا کر
نہ تو باہر ہے عالم سے نہ وُہ باہر ہے عالم سے

طلب گر نعمتِ اعلیٰ کی ہے کم پر قناعت کر
گُلوں کو دیکھ پیاس اپنی بجھا لیتے ہیں شبنم سے

خدا ہی دے جزا اسکی شہیدانِ محبت کو
دلوں پر داغ کیا کیا لے گئے اس باغِ عالم سے

خدا بخشے۔ بیابانِ جنوں میں گو اکیلا تھا
بڑی رونق تھی اے سجاد پھر بھی قیس کے دم سے

سجاد عظیم آبادی

اے خدا سُن لے میری پنجاب کو لے چل مجھے
رات دن گُڑھتا ہُوں میں پڑتی نہیں ہے کل مجھے

ہے مجھے ہر دم ستاتی یادِ یارانِ وطن
کب تلک رکھیگا تو اس طرح سے بیکل مجھے

صبح کرنا شام کا کم سو مصیبت سے نہیں
ہے قیامت سے زیادہ آج کرنا کل مجھے

دل لگے کیا خاک جب دلبر ہی پہلو میں نہ ہو
بے ترے اے نازنیں کیا لطفِ سیرِ ڈل[1] مجھے

ہے مرے پیشِ نظر اُٹھوں پہر وقتِ وداع
ہائے وُہ کہنا کسیکا پیار سے "لیچل" مجھے

وصل میں بھی کیوں نہیں ہوتا ہے اطمینانِ قلب
مرشدِ کامل سے کرنا ہے یہ عقدہ حل مجھے

اے خدا چھوڑے گی کب مجھ کو مری آشفتگی
مٹنے بھی دیگی آخر زیست کی ہل چل مجھے

خاک میں تنہا لٹا کر چل دیئے صادق رفیق
زندگی بھر کی وفا کا یہ ملا ہے پھل مجھے

صادق (از سری نگر کشمیر)

بلا وجہ مجھ سے خفا ہو گیا
خدا جانے اس بُت کو کیا ہو گیا

کروں کیا میں شکوہ ترے جور کا
مقدر کا اپنے لکھا ہو گیا

نہ چھیڑ اے فلک ورنہ نالہ مرا
غضب ڈھائیگا گر رسا ہو گیا

۱؎ کشمیر کی مشہور سیرگاہ جھیل ڈل ۱۲

لعابِ دہن ترا اے بحرِ حُسن
مرے حق میں آبِ بقا ہوگیا

نہیں چین دیتا ہمیں ایک دم
فلک تجھ کو آخر یہ کیا ہوگیا

شبِ وصل اتنا بڑھا رُعبِ حُسن
جو بیجا تھا وُہ بھی بجا ہوگیا

زمانے کا شیدا عجب رنگ ہے
ذرا دیر میں کیا سے کیا ہوگیا

شیدا (از علی گڈھ)

ترے فراق میں جینا بشر کا کام نہیں
ہزار شکر کہ اس عمر کو دوام نہیں

گلوں کو کہتی ہے چونکا کے یُوں نسیمِ سحر
چلے چلو کہ ٹھہرنے کا یہ مقام نہیں

خدا کی یاد میں حورونکی یاد اے واعظ
نگاہِ غیر پہ کرنا۔ یہ کیا حرام نہیں

تمام عمر بھی سُنئے اگر تو جی نہ بھرے
کلامِ یار ہے انسان کا کلام نہیں

چمک میں ذرہ و خورشید دونوں یکساں ہیں
گلی میں یار کی کچھ فرقِ خاص و عام نہیں

دعائے خوابِ اجل ہجر میں مناسب ہے
یہی وُہ شے ہے جو عشاق پر حرام نہیں

گلے پہ چلنے دو رُک رُک کے تیغِ قاتل کو
مقامِ صبر ہے عجلت کا یہ مقام نہیں

قیامت آئے اُٹھے روئے یار سے پردہ
خدا وہ صبح دکھائے کہ جسکی شام نہیں

وہ میرے دل میں تصوّر کو اپنے رہنے دیں
خُدا کا گھر ہے کوئی خوف کا مقام نہیں

سمندِ عمر کو آباد روکئے کیونکر
زیادہ اِس سے کوئی رخشِ تیزگام نہیں

آباد عظیم آبادی